اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

جمیل یوسف

پاکستانی ادب کے معمار

سر سیّد احمد خان
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

سرسید احمد خان
شخصیت اور فن

جمیل یوسف

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	:	افتخار عارف
منتظم	:	ظہیر الدین ملک
تدوین و طباعت	:	سعیدہ درانی
اشاعت اول	:	1999ء
اشاعت دوم	:	2008ء
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: -/220روپے غیر مجلد: -/210روپے

ISBN: 978-969-472-165-1

فہرست

پیش نامہ افتخار عارف 7
پیش لفظ جمیل یوسف 9
بچپن اور جوانی 25
ملازمت 39
آثار الصنادید 43
تحریر و تصنیف کا مزید کام 47
آئینِ اکبری 49
1857ء 53
مسلمانوں کے دفاع میں سر سیّد کا جہاد 59
تاریخِ فیروز شاہی 65
مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین نفرت اور تعصب ختم کرنے کی کوششیں (تبیین الکلام) 67
سائنٹیفک سوسائٹی 71
علی گڑھ اخبار 75
اُردو ہندی تنازع 79
سفرِ انگلستان 83
خطباتِ احمدیہ 89
تہذیب الاخلاق 99
علی گڑھ تحریک کا آغاز 101

ہنٹر کی کتاب کا جواب	113
تفسیر القرآن	115
رسالۂ ابطالِ غلامی	119
کونسل کی رُکنیت	123
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس	129
سرسید اور انڈین نیشنل کانگرس	133
کالج کا بحران	141
وفات	147
شخصیت و کردار	151
سرسید کا کارنامہ	161
سرسید اور اُردو ادب	167
کتابیات اور حوالہ جات	173

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معمارانِ ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

سر سید احمد خان کا شمار ہمارے ان عظیم المرتبت محسنوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ساری عمر اپنے زمانے کی ملت مسلمہ اور بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کی فلاح و اصلاح کی نذر کر دی۔ سر سید احمد خان نے برصغیر کے مسلمانوں کی ایسے کڑے وقت میں دست گیری اور راہ نمائی کی جب وہ ہمہ جہت زوال و ادبار کی زد میں تھے۔ تحریک پاکستان کے بنیاد گذاروں میں سر سید احمد خان کا نام سرفہرست آتا ہے کیوں کہ برصغیر کے مسلمانوں کے مصائب و مسائل کے احوال دیکھ کر انہوں نے سب سے پہلے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا قیام ناگزیر ہے۔ علم و ادب، مذہب و سیاست، تاریخ و تہذیب، تحقیق و تنقید، فکر و فلسفہ الغرض کتنی ہی جہتیں ہیں جو ایک ہی شخص میں سما گئی ہیں۔ سر سید احمد خان کی خدمات کے ہمہ پہلو حوالوں سے نئی نسل کو آگاہ رکھنا بے حد ضروری ہے لہٰذا اکادمی ادبیات پاکستان نے سر سید احمد خان: شخصیت اور فن کے نام سے پیشِ نظر کتاب شائع کی۔ اب اس کتاب کے تازہ مگر نظر ثانی شدہ ایڈیشن کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔

جمیل یوسف اردو غزل کے معروف شاعر ہیں مگر نثر کی بھی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر انہوں نے سر سید احمد خان: شخصیت اور فن لکھی اور اب اس پر نظر ثانی کر کے کچھ ترامیم اور اضافے بھی کیے۔ امید ہے یہ کتاب سر سید احمد خان کی شخصیت اور فن کو سمجھانے میں یقیناً معاون ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ سے کسی انگریز نے پوچھا تھا کہ دوقومی نظریے کا بانی کون ہے؟ قائدِ اعظمؒ نے برجستہ جواب دیا: ''ہر مسلمان'' اور پھر وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''جب کوئی ہندو اسلام قبول کر کے مسلمان ہو جاتا ہے تو وہ ایک نئی قوم کا فرد بن جاتا ہے۔''

712ء میں جب محمد بن قاسمؒ نے موجودہ کراچی سے لے کر ملتان تک کے علاقے پر اسلام کا جھنڈا لہرایا اور عرب لوگ سندھ اور ملتان میں آباد ہوئے اور پھر ان کے ساتھ میل جول سے مقامی باشندے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب اور طور طریقے چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تو برِ صغیر میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔ اب اس قوم کا ہیرو راجہ داہر نہیں تھا ان کا ہیرو محمد بن قاسمؒ تھا۔ یہ نئی مسلمان قوم جو وجود میں آئی ہندوؤں سے ہر لحاظ سے مختلف بلکہ متضاد تھی۔ ان دونوں کے درمیان اس قدر اختلافات حائل تھے کہ ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن تھا۔ جو چیز ایک کے نزدیک مقدس اور متبرک تھی دوسرے کی نظر میں ناپاک اور پلید تھی۔ آپس میں شادی بیاہ تو درکنار ایک برتن میں کھانا پینا ممنوع ٹھہرا۔ دونوں کے جملہ طور طریقے رسم و رواج، رہن سہن، نام و نسب، ماہ و سال، لباس، زبان، رسم الخط، انفرادی نقطۂ نظر، اجتماعی آرزوئیں اور اُمنگیں غرض ہر چیز ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ اسی حقیقت اور تاریخی صداقت کا نام دوقومی نظریہ ہے۔ یہ حضرت قائدِ اعظمؒ کا بنایا ہوا ہے نہ علامہ اقبالؒ کی سوچ کا نتیجہ ہے اور نہ یہ سرسیّد احمد خانؒ کے ذہن کی اختراع ہے مگر سیاسی سطح پر اس تاریخی صداقت کا واضح اور غیر مبہم اظہار سب سے پہلے سرسیّد ہی نے کیا تھا۔

سرسیّد احمد خان تحریکِ پاکستان کا وہ اہم موڑ اور وہ نمایاں ترین سنگِ میل ہیں جو نہ صرف راستے کا تعین کرتا ہے بلکہ منزل کا سراغ بھی دیتا ہے۔ سرسیّد ہی نے اس راستے کی صورت گری کی جس پر چل کر بعد میں آنے والے قائدین، قیامِ پاکستان کی منزل تک پہنچے، بلکہ انہوں نے دِل شکستہ اور ہمت ہارے

ہوئے بے یار و مددگار مسلمانوں کو اس کٹھن راستے پر سرگرمِ سفر ہونے کے لئے بھی تیار کیا۔ علی گڑھ کی عظیم درسگاہ دراصل تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے کی تربیت گاہ تھی۔ یوں محمد علی جناحؒ اگر برِ صغیر کے مسلمانوں کے قائدِ اعظم تھے تو سر سید احمد خان کو بجا طور محسنِ اعظم کہنا چاہیئے۔

سر سیّد احمد خان کے حالات و واقعات، ان کی خدمات اور ان کی مہمات کا خیال کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسا عظیم شخص تھا؟ دراصل کئی شخصیتیں اس ایک شخص میں جمع ہو گئیں تھیں۔ کس شعبے میں اس نے اَنمٹ نقوش نہیں چھوڑے؟ کس گوشے میں شمعیں روشن نہیں کیں؟ کس راستے پر چراغ نہیں رکھے؟ مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم، سیاست، خطابت، اُردو نثر، مضمون نویسی، ادارت، انجمن سازی، انجینئرنگ، آثارِ قدیمہ، تاریخ نویسی، غرض قومی زندگی کے ہر شعبے میں اُس بطلِ جلیل نے اپنے پیچھے آنے والوں کیلئے روشن اور اَن مِٹ نقوشِ قدم چھوڑے۔ جس راستے کا بھی انہوں نے تعین کیا، قدامت پرستوں اور روایت پسندوں کی شدید مخالفت کے باوجود اس پر آگے بڑھتے رہے۔ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود زمانہ آج تک ان کی دانش مندی اور ان کے فیصلوں کی درستی اور ان کے قول و فعل کی راستی پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا چلا آتا ہے۔

سر سیّد کے سوانح نگار مولانا الطاف حسین حالیؔ رقم طراز ہیں:

"انہوں نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علماء و مفسرین کو للکارا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور انہیں کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ ان کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق کا خطاب دیا ہے۔ پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور (ابن الوقت) سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ سر سیّد کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا، اس لیئے ضروری ہے کہ ان کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے اُسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

سر سیّد نے قلم اُٹھایا تو اُردو نثر کو سہل اور رواں دواں مگر دلنشیں پیرائے میں اپنا مطلب بیان کرنے کا سلیقہ عطا کر دیا۔ نثری ادب میں طرزِ جدید کی داغ بیل ڈال دی۔ مضمون نگاری کے فن کی بنیاد رکھ دی۔ تقریر کرنے اُٹھے تو وائسرائے ہند لارڈ لٹن جیسے عالم فاضل شخص سے اِن الفاظ میں خراجِ تحسین حاصل کیا: "میں نے ایسی عالمانہ تقریر کبھی نہیں سنی تھی۔"

(حیاتِ جاوید، ص۔ 242)

انہوں نے تعلیم کے میدان میں قدم رکھا تو ایم اے او کالج علی گڑھ جیسی عظیم اور باوقار درسگاہ قائم کر دی جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی بنی۔ علیگ کا لفظ ایسے ہی عزت و احترام کا حامل بن گیا جس طرح آکسن (آکسفورڈ) اور کینٹب (کیمبرج) کے الفاظ ہیں۔

کسی کارنامے کی عظمت کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان حالات کو مدِنظر رکھا جائے جن حالات میں وہ کارنامہ سرانجام دیا گیا، اس چیلنج کو دیکھا جائے جو اس وقت درپیش تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ 712ء میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے لے کر 1857ء تک کسی دور میں بھی بّرِصغیر کے مسلمان کبھی ایسی بے بسی اور کسمپرسی کا شکار نہیں ہوئے تھے جو 1857ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد گویا اُن کا مقدر بن گئی تھی۔ بلا مبالغہ وہ اوجِ ثریا سے تحت الثریٰ کی پستیوں میں جا گرے۔ جس ملک پر انہوں نے آٹھ سو سال تک بڑی شان اور بڑے دبدبے سے حکومت کی تھی، وہاں اُنہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں مل رہی تھی۔ ہندو مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ غلامی سے آزاد ہونے کی خوشی میں سرمست تھے۔ وہ اپنے نجات دہندہ اور نئے آقا انگریز کی شفقت اور بھرپور مدد سے ایک نئے قومی جذبے کے ساتھ ہر میدان میں اپنی پوزیشن مستحکم کر رہے تھے۔ چونکہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی وہ اُنہیں ہی اپنا حریف سمجھتے تھے اس لیئے وہ مسلمانوں کی باقی ماندہ قوت کے ہر نشان کو سختی سے کچل دینا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے جنگِ آزادی (انگریزوں کے بقول میوٹنی یعنی غدر) کا سارا الزام مسلمانوں کے سر آیا۔ انگریز مسلمان زعماء اور اشرافیہ کو ایک ایک کر کے توپوں سے اُڑا رہے تھے۔

جب 1857ء کے کچھ عرصہ بعد گیرودار کا بازار قدرے ٹھنڈا پڑا تو مسلمانوں کے علاقوں میں قبرستان کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی کا شعلہ راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سلطنت کیا چھن گئی، زندگی گزارنے کا حوصلہ ہی جاتا رہا تھا۔ مستقبل کے اُفق پر دُور دُور تک روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جدھر نگاہ اُٹھتی تھی، مایوسی اور بے یقینی کے گہرے سائے اس کا استقبال کرتے تھے۔ حالات کا

مقابلہ تو دُور کی بات ہے مسلمان اپنی جانیں بچانے کیلئے پناہ گاہیں ڈھونڈھ رہے تھے۔ ایسے حوصلہ شکن اور رُوح فرسا حالات میں سر سیّد احمد خان مسلمان قوم کی دستگیری کو آگے بڑھے۔

''مطالعۂ سر سیّد احمد خان'' کے نام سے بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے جو کتاب مرتب کی ہے اس میں حالات و افکار کے عنوان سے ڈاکٹر نذیر احمد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''اگر سر سیّد نہ اُٹھتے تو ہندوستان کے مسلمانوں کا وہی حال ہوتا جو سپین کے مسلمانوں کا ہوا تھا۔''

مولانا صلاح الدین احمد اپنے مضمون ''سر سیّد احمد خان پر ایک نظر'' میں رقم طراز ہیں:۔

> ''یاد رکھئے کہ اگر سر سیّد قومی وحدت اور قومی ہستی کی بنیاد استوار نہ کرتے، جس پر علی گڑھ کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی اور قومی احساس اور روشن خیالی کی وہ شمع روشن نہ کرتے جو آج سے کم و بیش ایک سو پچیس سال پیشتر انہوں نے روشن کی اور ہمیں بلا کے پنجے اور ذہنی استبداد سے نجات دلا کر زندگی کی صحیح اقدار سے روشناس نہ کراتے تو آج ظلمستانِ ہند میں ہم نیم وحشی قبائل کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔''

ان حالات میں سب سے بڑا اور فوری مسئلہ نفرت اور دشمنی کی وہ خلیج تھی جو مسلمان محکوموں اور انگریز حاکموں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔ مسلمان انگریزوں کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ جہادِ آزادی کچل دینے کے بعد بھی انگریزوں کو اگر کوئی خطرہ تھا تو مسلمانوں ہی سے تھا۔ سر سیّد احمد خان یہ جانتے تھے کہ ان دونوں کے درمیان بد اعتمادی اور منافرت دُور کرنے اور اسے مکالمے اور اعتماد کی فضا سے بدلے بغیر مسلمانوں کو سنبھالا دینے کی کوئی صورت نہیں۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے جنگ آزادی کے اسباب و علل پر رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' تحریر کیا۔ اس کی ہزاروں کاپیاں چھپوا کر انگریزوں میں تقسیم کیں اور برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان کو بھیجیں۔ اس رسالے میں انہوں نے افہام و تفہیم سے مسلمانوں اور انگریزوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ مستقبل میں 1857ء جیسے خونریز واقعات کا سدِ باب ہو سکے۔ رسالہ بغاوت ہند لکھنے پر ایک طرف مسلمانوں نے سر سیّد کو انگریزوں کا ایجنٹ کہا اور دوسری طرف انگریزوں نے حکومت پر بے باک نکتہ چینی کی وجہ سے انہیں مارشل لاء کے تحت گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم کرنے کی دھمکی دے دی۔

مسلمان انگریزوں سے متنفر تھے انگریزی سے کیسے متنفر نہ ہوتے ،انہوں نے من حیث القوم انگریزی سیکھنے سے انکار کر دیا۔ انگریزوں کو جان کا دشمن اور انگریزی کو ایمان کا دشمن قرار دیا۔ دوسری طرف ہندوؤں کا یہ حال تھا کہ وہ بڑے ذوق وشوق بلکہ جوش وخروش سے انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور انگریزی میں استعداد بہم پہنچا کر سرکاری ملازمتوں پر متمکن ہو رہے تھے۔ سلطنت اور کاروبارِ حکومت تو مسلمانوں سے چھن چکے تھے اور کوئی کام اُنہیں آتا نہیں تھا۔ زندگی کرنے کی کوئی صورت ہو تو کیونکر ہو۔ انگریزی پڑھے بغیر ملازمت اُنہیں مل ہی نہیں سکتی تھی۔

سرسیّد پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں انگریزی سیکھے بغیر مسلمانوں کیلئے ترقی کی راہ پر ایک قدم آگے بڑھانا بھی ناممکن تھا، مگر مسلمان انگریزی کا نام تک سننے کو تیار نہ تھے۔ اس گہری نفرت اور اندھے تعصب کے خلاف آواز بلند کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سرسیّد احمد خان نے اس انتہائی مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن کام کا بیڑا اُٹھایا۔ انگریزی سیکھنے اور مغربی علوم کی ضرورت واہمیت پر جگہ جگہ تقریریں کیں ،مضامین لکھے۔ اہلِ مذہب کو بتایا کہ عربی اور فارسی کے علاوہ بھی دُنیا کی باقی زبانوں میں مفید علوم موجود ہیں۔ عربی کے علاوہ دوسری زبانیں سیکھنا بھی مسلمانوں پر فرض ہے تاکہ ان زبانوں میں موجود علوم سے آگاہی ہو۔ اہلِ مذہب انگریزی سیکھنے والوں کو کافر قرار دے رہے تھے۔ سرسیّد نے تن تنہا ان کا مقابلہ کیا۔ ان کے دلائل کا توڑ ڈھونڈا۔ ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمانوں کے سربرآوردہ خاندانوں میں جا کر ان کو قائل کیا کہ بچوں کو انگریزی تعلیم دلوائیں۔ ایک یہی کام اتنا بڑا اور اتنا مشکل تھا کہ پوری زندگی اسی کیلئے درکار تھی۔ یہ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہ تھی مگر سرسیّد نے نہ صرف مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے حق میں قائل کیا بلکہ اس کیلئے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل (ایم او اے) کالج بھی قائم کر دیا۔ اس درسگاہ کو جدید بنیادوں پر قائم کرنے اور صحیح خطوط پر چلانے کا شعور حاصل کرنے کیلئے سرسیّد بحری جہاز سے انگلستان بھی گئے اور وہاں آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں اور پبلک سکولوں کے سسٹم کا جائزہ لیا اور پھر انہی خطوط پر مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم کیا۔

یہ سرسیّد کی شبانہ روز جدوجہد کا ثمر تھا کہ وہ مسلمان جو انگریزی کے نام سے بدکتے تھے ان میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان جیسے مذہبی خاندانوں کے چشم وچراغ انگریزی زبان کے صاحب طرز ادیب اور خطیب بن گئے۔ مولانا محمد علی جوہر کی انگریزی دانی پر تو انگریز خود حیران تھے۔

مسلمانوں کے تعصب اور غلط مذہبی نظریات وعقائد کے توڑ اور ان کی اصلاح کیلئے سرسیّد نے اتنی

زیادہ تعداد میں مضامین قلم بند کیے کہ ان کی ضخامت دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں وہ اتنے سارے کاموں کیلئے وقت کہاں سے نکال لیتے تھے؟ یہ مضامین ان کے اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' اور دوسرے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ اب مقالاتِ سرسیّد اور خطباتِ احمدیہ کے نام سے کئی ضخیم جلدوں میں ان مضامین کو جمع کر کے چھاپ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے قرآنِ حکیم کی تفسیر اور حضرت محمد ﷺ کی سیرت بھی لکھی اور ان میں عیسائی مصنفین اور مبلغین کے اعتراضات کے جوابات دلائل اور اسناد کے ساتھ دیے۔ گویا سرسیّد نے انگریزی حکومت کے زیرِ سایہ کام کرنے والے عیسائی مشنریوں کی یلغار کو بھی روکا اور خود مسلمانوں کے دِلوں میں شکست و ریخت کے ساتھ جو مذہبی بددِلی اور اسلام سے دُوری اور عقائد میں پراگندگی پیدا ہو رہی تھی اس کا سدِ باب بھی کیا۔ فکر و تحقیق سے عاری قدامت پرست، تنگ نظر ملاؤں نے سرسیّد کے خلاف خوب مہم چلائی۔ انہیں انگریزوں کا ایجنٹ اور کافر وزندیق کہا۔ کرسٹان کا لقب دیا مگر سرسیّد جس کام کو صحیح اور مسلمانوں کے بہترین مفاد میں ضروری سمجھتے تھے مخالفتوں اور اپنے خلاف لگائے گئے بے سروپا فتوؤں کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کی انجام دہی میں لگے رہے۔

اسلام کے بارے میں سرسیّد احمد خان کا نقطۂ نظر کیا تھا اور وہ کس طرح کے مسلمان تھے، اُن کے معتمدِ خاص مولانا الطاف حسین حالؔی سے سنیئے:

''اگر مسلمان سے یہ مراد ہے کہ دینِ اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے نہ کہ ماں باپ کی تقلید سے یقین واثق رکھتا ہو، اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کی تعلیم دینے والا، غیر مذہب والوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کی تعلیم دینے والا اور فتنہ وفساد وظلم و بے رحمی کی بیخ کنی کرنے والا، غرض کہ اس کی تعلیم کو نوعِ انسانی کے حق میں سراسر رحمت اور برکت سمجھتا ہو، خدا کے سوا کسی کو مستحقِ عبادت اور نبیؐ کے سوا کسی انسان کا قول واجب اتباع نہ جانتا ہو، اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد خیال کرتا ہو، مسلمانوں کی عزت چاہنے والا اور اُن کی ذِلت پر افسوس کرنے والا ہو، جس بات کو سچ جانے اس کے ظاہر کرنے میں کسی کی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو، معاملات میں راست باز ہو اور برائی کے عوض میں بھی بھلائی کے سوا کچھ نہ کرے تو شاید سیّد احمد خان جیسا مسلمان زمانے میں مشکل

سے ملے گا۔ لیکن اگر مسلمان سے یہ مراد نہیں بلکہ اس لفظ کے حقیقی مصداق وہ لوگ ہیں جو تعصب کو دینِ اسلام کا رُکن رکین سمجھتے ہیں، ذرا ذرا سے اختلافات پر جماعت اسلام کو پراگندہ کرنا اپنا فرض جانتے ہیں، جن کو آئمہ مجتہدین کی تقلید نے قرآن اور حدیث سے مستغنی کر دیا ہے، جو قرآن کو محض تلاوت کرنے کی کتاب اور حدیث کو صرف سند لینے کی چیز خیال کرتے ہیں، جو احکامِ ظاہری پر لمبے لمبے وعظ کہتے ہیں، آمین اور رفع یدین کی بحث میں عمریں گزار دیتے ہیں، وضع ولباس میں غیر قوموں سے مشابہت کو محاربۂ خدا اور رسول ﷺ کی حد تک پہنچا دیتے ہیں، قوم کے اخلاق کی درستی کا جس کی نسبت نبی ﷺ نے کہا تھا کہ **بعثت لا تمم مکارم الاخلاق**، کبھی بھول کر بھی خیال نہیں کرتے، جن کے وعظ ونصیحت کا سوائے اس کے مسلمانوں میں افلاس، نااتفاقی، بغض اور کینہ کو ترقی ہو، اہلِ قبلہ میں ہمیشہ کھٹا پٹی رہے، اسلام مطعون ہو اور قوم کو دُنیا میں رہنا مشکل ہو جائے تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ (اگر مسلمان کا یہ مطلب ہے) تو ان معنوں میں سیّد احمد خان کو مسلمان کہنا صحیح نہ ہوگا۔''

(حیاتِ جاوید ص 556)

مولانا الطاف حسین حالی کے مندرجہ بالا اقتباس کی سطور جب میں نقل کر رہا تھا تو یہ خیال بار بار میرے ذہن میں آتا رہا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح بھی سو فیصد سر سیّد احمد خان کی طرح تھے۔ ان پر بھی صحیح اور سچے مسلمان کی یہ تعریف پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔

سیاست کے میدان میں سر سیّد احمد خان نے جو اَنمٹ آثار اور روشن نقوش چھوڑے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بلاشبہ بَرِ صغیر میں مسلمانوں کے ان تمام راہنماؤں کے پیش رَو ہیں جن کی جدّ وجہد اور سوچ بالآخر قراردادِ پاکستان کی شکل میں صورت پذیر ہوئی۔

سر سیّد احمد خان نے ''اسبابِ بغاوت ہند'' میں لکھا تھا کہ چونکہ وائسرائے کی مجلس قانون ساز میں کوئی مقامی نمائندہ نہیں ہے اس لیے حکومت پالیسی ساز سطح پر مقامی باشندوں کے جذبات واحساسات اور ان کی سوچ سے آگاہی نہیں رکھتی جس کی وجہ سے حکومت کیلئے صحیح حکمتِ عملی اختیار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ دونوں طرف غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور شکوک شبہات جنم لیتے ہیں اور تخریب پسند عناصر حکومت کے

خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ وہ وائسرائے کی کونسل میں مقامی ارکان کو بھی شامل کریں۔ حکومت نے اس مشورے کو صائب سمجھتے ہوئے سب سے پہلے سرسیّد احمد خان ہی کو کونسل کا رُکن نامزد کر دیا۔ 1878ء میں لارڈ لٹن کے ایک حکم نامے کی رُو سے سرسیّد احمد خان وائسرائے کی کونسل یعنی مجلس قانون ساز کے ممبر بن گئے۔ گویا انگریزی حکومت میں پالیسی ساز اور فیصلہ کن سطح پر برِصغیر کی مقامی نمائندگی کا آغاز بھی سرسیّد سے ہوا۔ اپنی اس حیثیت میں مقامی باشندوں اور خاص کر مسلمانوں کے اجتماعی مسائل حل کرانے کیلئے انہوں نے مجلس قانون ساز میں کئی تقریریں کیں اور چند ایک بل بھی پیش کیے۔ ان میں قاضیوں کے تقرر کا بل بھی قابل ذکر ہے۔ اُنہوں نے وقف پر بھی ایک بل کا مسودہ تیار کیا تھا مگر بعض قانونی رکاوٹوں کے باعث اُسے کونسل میں پیش نہ کر سکے۔

مقامی باشندوں اور مسلمانوں کی مؤثر نمائندگی کے قومی کام میں سیّد احمد خان نے کس جذبے، جاں فشانی اور محنت سے اپنے فرائض انجام دیئے، اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ سیّد احمد خان کو انگریزی میں خاطر خواہ دسترس حاصل نہ تھی۔ کونسل کی ساری کاروائی انگریزی میں ہوتی تھی، چنانچہ سرسیّد احمد خان کونسل میں اپنی تقریر کی تیاری اس طرح کرتے کہ وہ تقریر پہلے اُردو میں لکھتے، اس کا ترجمہ انگریزی میں کرواتے، پھر اس انگریزی تقریر کو اُردو رسم الخط میں لکھتے۔ مشکل الفاظ کے تلفظ کی ادائیگی کی مشق کرتے۔ تقریر پر اتنی محنت کرتے کہ ان کے لب ولہجہ اور ادائیگی پر یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ وہ اُردو رسم الخط میں لکھی ہوئی انگریزی تقریر پڑھ رہے ہیں۔ ان کی تقریر اتنی مدلل اور موثر ہوتی کہ وائسرائے اور کونسل کے دوسرے حاضرین سب ان کی تقاریر کی تعریف کیا کرتے۔ وہ اپنے موضوع کے ہر پہلو کو لیتے اور اس کے ہر نکتے پر دلائل اور اسناد کی مدد سے سیر حاصل تبصرہ کرتے۔ کوئی نکتہ تشنہ نہ رہنے دیتے۔

دوسروں کو قائل کرنے کی ان میں بڑی صلاحیت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خود اعتمادی اور یقین کی جو دولت ارزانی کر رکھی تھی، وہ بڑی سے بڑی مخالفت کو پرِکاہ کی طرح بہا کر لے جاتی۔ قائدِ اعظمؒ کی طرح وہ بھی جس چیز کو صحیح سمجھتے، بلا خوف و خطر بر ملا اس کا اظہار کرتے اور مخالفتوں کی بالکل پرواہ نہ کرتے۔ قائدِ اعظمؒ کی طرح انہوں نے بھی اس فکر میں کبھی اپنا ذہن پریشان اور اپنا وقت ضائع نہ کیا کہ دوسرے ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ بقول الطاف حسین حالؔی ان کا یہ اصول تھا کہ ''جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور جو کچھ کہو اس کو کر دکھاؤ۔'' سرسیّد کی ساری زندگی ان سنہرے اور عظیم

اصول کی روشن مثال ہے۔ دُنیا کے سارے بڑے بڑے مصلحین اور پیغمبروں کا یہی اصول تھا۔

ایس ایم برک اور ایس ڈی قریشی اپنی کتاب قائدِ اعظم محمد علی جناح میں سر سیّد احمد خان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سیاسی میدان میں جو لائحہِ عمل سر سیّد نے اپنے لئے مرتب کیا وہ بنیادی طور پر تین نکات پر مشتمل تھا:

1) انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی اور منافرت کی جو فضا پیدا ہو گئی تھی اسے افہام و تفہیم اور باہمی رواداری میں بدلنا۔

2) مسلمانوں کو مغربی تعلیم کے ذریعے زندگی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تاکہ وہ زندگی کے ہر میدان میں برابری کی سطح پر ہندوؤں کا مقابلہ کر سکیں۔

3) انڈین نیشنل کانگرس کی ایسی پالیسیوں اور اس کے ایسے مطالبات کی مخالفت کرنا جن کے ذریعے ہندو اپنی بہتر صلاحیتوں اور اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں پر غلبہ پانے کی کوشش کریں۔

مسلمانوں پر ہندوؤں کے تسلط کی ہر صورت اور اس کے ہر امکان کا سدِ باب کرنا سر سیّد کی زندگی کا مشن تھا۔ انہیں یہی خدشہ لاحق رہا جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا کہ ''کہیں مسلمان اہلِ کتاب (یعنی انگریزوں) کی بجائے ہندوؤں کی رعیت نہ بن جائیں۔''

آپ ان الفاظ پر غور کریں۔ 1940ء میں قراردادِ پاکستان منظور کرنے والے مسلم لیگ کے اجلاس کے مدِ نظر بھی ہو بہو کیا یہی خدشہ نہ تھا کہ کہیں انگریزوں کے چلے جانے کے بعد مسلمان ہندوؤں کے غلام نہ بن جائیں۔

سر سیّد خان کہتے تھے کہ اگر مسلمان پستی اور ذلت کا شکار ہو جائیں تو یہ اسلام کی پستی سمجھی جائے گی۔ وہ کہتے تھے کہ ہر دور کا اپنا رنگ ڈھنگ اور اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ اگر ہم بدلے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو نہیں بدلیں گے تو ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کا مؤقف تھا کہ اب اعلیٰ تعلیم اور مغربی علوم حاصل کئے بغیر مسلمانوں کے لئے عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنا ممکن نہیں رہا۔ وہ کہتے تھے میری آرزو ہے کہ مسلمان قوم میں تعلیم عام کرنے کے ساتھ ساتھ دو اور خوبیوں کو بھی رواج دُوں:- ایک، اعلیٰ کردار کی تربیت، دوسرے، مسلمانوں میں قومی یک جہتی اور باہمی ہمدردی کا جذبہ۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ دُور دراز اور مختلف علاقوں کے مسلمان طلبا ایک جگہ اکٹھے رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کریں،

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ قائم کیا۔ 8 جنوری 1877ء کو وائسرائے نے اس کالج کا افتتاح کیا جو 1920ء میں یونیورسٹی بن گیا۔ اس درسگاہ کے طفیل پہلی دفعہ برصغیر کے طول و عرض سے آئے ہوئے اچھے گھرانوں کے نوجوانوں کو ایک جگہ اکٹھے ہو کر تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، 1878ء میں لارڈ لٹن نے سرسیّد کو وائسرائے کی کونسل کا رکن نامزد کیا۔ دو سال بعد انہیں مزید دو سال کیلئے نامزد کر دیا گیا۔ اس کونسل میں سرسیّد کی سرگرمیوں سے ان کی وہ سیاسی سوچ سامنے آتی ہے جو اس حقیقت کا واضح ادراک مہیا کرتی ہے کہ ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ دو قومیں آباد ہیں، دو ایسی قومیں جن کا آپس میں کبھی سیاسی اور معاشرتی سمجھوتہ ہو ہی نہیں سکتا۔

15 جنوری 1883ء کو میونسپل کونسلوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے قیام سے متعلق لارڈ رپن کے لوکل سیلف گورنمنٹ کے بل پر مجلس قانون ساز میں تقریر کرتے ہوئے سرسیّد احمد خان نے کہا:

''انگلستان کی نمائندہ حکومت کا طریق کار یہاں ہندوستان میں نافذ کرتے وقت یہ بہت اہم ہے کہ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھا جائے کہ یہاں کے معاشرتی اور سیاسی حالات انگلستان سے بہت مختلف ہیں۔ ہندوستان ایک ملک نہیں۔ یہ تو ایک بَرِ اعظم ہے جہاں مختلف قوموں اور نسلوں اور متضاد عقیدوں کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں کی مذہبی عصبیتوں نے پڑوسی کو پڑوسی سے جدا کر رکھا ہے۔ ذات پات کے بندھن نے خود غیر مسلموں کو مختلف طبقوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ہر ضلع میں مختلف قومیں، متعدد برادریاں اور کئی نسلیں رہ رہی ہیں۔''

سرسیّد احمد خان نے مزید کہا:

''نمائندہ حکومت کا اصول آبادی کی اکثریت کے خیالات و نظریات کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ سسٹم یہاں اختیار نہیں کیا جا سکتا، یہاں اکثریت اقلیت کے مفادات کو مکمل طور پر کچل کر رکھ دے گی۔''

سرسیّد کی اس تقریر پر ہندوؤں نے اور ہندو پریس نے بڑا واویلا مچایا۔ سرسیّد کی اصل بات کو نظروں سے اوجھل کرنے کی غرض سے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ سرسیّد انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔ یہ چاہتا نہیں کہ حکومت میں مقامی لوگوں کو شریک کیا جائے۔ وہ ہندوستانی قوم میں پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ

انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو والی پالیسی میں ان کی مدد کر رہا ہے۔ یہی وہ بے سروپا پروپیگنڈہ ہے جو کانگرس اور گاندھی نے 1947ء تک مسلم لیگی قیادت کے خلاف جاری رکھا تا کہ مسلمانوں کے ذہن میں ایسا الجھاؤ اور مخمصہ پیدا ہو جائے کہ وہ اصل مسئلے پر توجہ ہی نہ دے سکیں بلکہ اصل مسئلہ سمجھ ہی نہ سکیں۔

دسمبر 1885ء میں بمبئی میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے پہلے اجلاس میں ہندوستان بھر سے 72 مندوبین شریک ہوئے جن میں صرف دو مسلمان تھے اور ان دونوں کا تعلق بمبئی سے تھا۔ ان دونوں مسلمان مندوبین میں سے کوئی بھی کسی معروف شخصیت کا مالک نہ تھا۔ دوسرا اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ اس اجلاس کے شرکاء کی تعداد 435 تھی جن میں مسلمانوں کی تعداد 31 تھی۔

کانگرس کو سارے ہندوستان کی مشترکہ اور نمائندہ جماعت کا رنگ دینے کیلئے اور ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کا تاثر اجاگر کرنے کیلئے ہندو یہ چاہتے تھے کہ کانگرس کے جلسوں میں مسلمان زیادہ تعداد میں شریک ہوں۔ انہوں نے متحدہ ہندوستانی قومیت کے تاثر کو ہوا دینے کی غرض سے بمبئی کی معروف اور معزز سماجی شخصیت بدرالدین طیب جی کو کانگرس کے تیسرے اجلاس منعقدہ مدراس (دسمبر 1887ء) کا صدر بنایا۔ سرسید احمد خان ہندوؤں کی چال کو سمجھ گئے انہوں نے تقریباً اسی وقت جب مدراس میں کانگرس کا اجلاس بدالدین طیب جی کی صدارت میں جاری تھا لکھنؤ میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کانگرس نے اپنے اجلاس مدراس میں یہ جو مطالبہ کیا ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں پر تقرریوں کیلئے ہونے والے مقابلے کے امتحانات لندن کی طرح ہندوستان میں بھی منعقد ہونے چاہیں اور وائسرائے کی کونسل کیلئے مقامی اراکین کا چناؤ انتخابات کے ذریعے سے ہو، یہ مسلمانوں پر ہندو غلبے اور تسلط کی سکیمیں ہیں۔ تعلیم میں وہ ہم سے بہت آگے ہیں۔ تعداد میں وہ بڑی بھاری اکثریت میں ہیں۔ امتحانات میں تو موجودہ حالات میں کسی مسلمان کا کامیاب ہونا ہی محال ہے اور کونسل کیلئے انتخابات میں جہاں ایک مسلمان ہونے کا امکان ہے وہاں چار ہندو کامیاب ہوں گے۔ اس طرح لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں میں اور وائسرائے کی کونسل میں ایک مسلمان کے مقابلے میں چار ہندو بیٹھے ہوں گے۔

جب مدراس میں کانگرس کا اجلاس ختم ہوا اور مندوبین اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تو 28 جنوری 1888ء کو سرسید نے بدرالدین طیب جی کو اس مضمون کا خط لکھا:

''آپ نے کانگرس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہندو ہم وطن اس پر بڑے خوش ہوئے ہیں، مگر جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اس سے دکھ ہوا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کہ یہ جو الفاظ ہیں نیشنل کانگرس...... ان سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب، مختلف ذاتوں اور برادریوں کے جو لوگ بس رہے ہیں وہ ایک قوم ہیں یا ایک قوم بن سکتے ہیں اور ان کے مقاصد اور آرزوئیں ایک ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل ناممکن ہے اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگرس قسم کی کسی چیز کا وجود بھی ممکن نہیں اور نہ یہ سب لوگوں کیلئے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔''

یہ سر سیّد احمد خان کے خط کا اثر تھا کہ بدالدین طیب جی نے پُر زور دعوت کے باوجود کانگرس کے اگلے اجلاس میں شرکت سے معذرت کر لی۔

مارچ 1888ء میں میرٹھ میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سر سیّد احمد خان نے فرمایا:

''ہندو مسلمانوں پر طرح طرح سے دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ کانگرس میں شامل ہو جائیں تاکہ وہ یہ بے بنیاد تاثر دے سکیں کہ کانگرس سارے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔ میں یہ بتا دیتا ہوں کہ یہ ہمارے (یعنی مسلمانوں کے) قومی مفادات میں دخل اندازی ہے اور اس کا کوئی جواز نہیں۔''

سر سیّد احمد خان نے مزید کہا:

''فرض کریں اگر کل انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو کیا ہندو اور مسلمان ایک تخت پر بیٹھ سکیں گے؟ یقیناً کبھی نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان میں سے ایک غالب ہو اور دوسرا مغلوب۔ ایک حاکم ہو اور دوسرا محکوم۔ انہوں نے کہا اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انگریزوں کی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے، وہ کم از کم اہلِ کتاب تو ہیں۔''

1896ء میں سیّد احمد خان نے محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرائے کو ایک یادداشت پیش کی۔ اس یادداشت میں انہوں نے مندرجہ ذیل نکات اُٹھائے:

1) شمال مغربی صوبہ جات کی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے مساوی نمائندگی دی جائے کیونکہ اگر ہندوؤں کو عددی اکثریت حاصل ہے تو مسلمان اپنے تاریخی پس منظر اور سیاسی اہمیت کی بنا پر ان سے کسی صورت کم تر نہیں۔

2) جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب بنائے جائیں جن میں مسلمان اپنے نمائندے خود چنیں۔

3) مسلمانوں کو ویٹ ایج (Weightage) دی جائے، یعنی ان کی آبادی کے لحاظ سے ان کے جتنے نمائندے بنتے ہیں ان کے نمائندوں کی تعداد اس سے زیادہ مقرر کی جائے۔

ایس ایم برک اور ایس ڈی قریشی اپنی گراں قدر تصنیف ''قائدِ اعظم محمد علی جناح'' میں رقم طراز ہیں:

''اگرچہ یہ مطالبات اس وقت قابلِ عمل نہ تھے مگر ان میں پاکستان کی اصل بنیاد بلکہ اس کے بیج موجود ہیں۔''

1906ء میں مسلمانوں کا جو وفد آغا خان کی سربراہی میں شملہ گیا تھا۔ اس وفد نے سرسیّد کی اسی متذکرہ بالا یادداشت میں اُٹھائے گئے نکات کی روشنی میں اپنے مطالبات مرتب کیے۔ بالآخر ان مطالبات کو 1909ء کی منٹو مارلے اصلاحات کے بل میں قانونی شکل دی گئی۔

عرصے بعد شملہ وفد کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر نے کانگرس کے 38ویں اجلاس کے موقع پر اپنے صدارتی خطبے میں کہا:

''اگلی نسل کے اعمال و کردار پر نظر ڈالتے ہوئے، اب جب کہ ہمارے لیے واقعے کے بعد عقل مندی کا مظاہرہ کرنا کہیں زیادہ آسان ہے، مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہے کہ سرسیّد احمد خان نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی میں نہایت بالغ نظری اور دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ میں یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ مسلمانوں کا کوئی خیر خواہ بلکہ صحیح معنوں میں پورے ہندوستان کا کوئی خیر خواہ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ سرسیّد احمد خان کی پالیسی بالآخر اپنے مطالبات منوانے میں اس لیے کامیاب ہوئی ہے کہ ان کا موقف حقیقی معنوں میں صائب اور صحیح تھا۔''

1885ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی تو سر سیّد احمد خان نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ اور ان کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کیلئے ایک تنظیم ہونی چاہیئے، چنانچہ انہوں نے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ طے پایا کہ اس کا اجلاس ہر سال اور ہر دفعہ ایک نئے شہر میں منعقد ہو۔ اس کانفرنس کا مقصد مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور اجتماعی مسائل پر غور وفکر کرنا اور ان کے حل کے لیئے لائحہ عمل مرتب کرنا تھا۔ دسمبر 1906ء میں اس کانفرنس کا سالانہ اجلاس پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈھاکہ میں ہُوا۔ اسی اجلاس کے مندوبین نے 30 دسمبر 1906ء کو نواب سلیم اللہ خان کی حویلی میں جمع ہو کر وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اور اس مسلم لیگ کے پرچم تلے اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلمانانِ برِ صغیر نے آزادی کی جو تحریک برپا کی، اس کا ثمر مملکتِ خداداد پاکستان اور بنگلہ دیش کی شکل میں آج نقشۂ عالم پر مرتسم ہے۔

حکایت از قدِ آں یارِ دلنواز
بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز

جمیل یوسف

دین چھوڑنے سے دُنیا نہیں جاتی مگر دُنیا چھوڑنے سے
دین بھی جاتا ہے

سر سیّد احمد خانؒ

بچپن اور جوانی

برِ صغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے عظیم محسن سر سیّد احمد خان 5 ذی الحج 1232 ہجری بمطابق 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود فرماتے ہیں:۔

"میری پیدائش دہلی کی ہے اور میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔"

دلی جو ایک شہر تھا رشکِ جناں و خلد ☆
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے [1]

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں مسلمان ہوں۔ ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔" [2]

وہ سیّد محمد متقی خان بہادر کے بیٹے، سیّد ہادی جواد الدولہ جواد علی خان بہادر کے پوتے اور نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کے نواسے تھے۔

سر سیّد احمد خان باپ کی طرف سے حسینی سیّد ہیں اور ان کا سلسلۂ نسب 36 واسطوں سے آنحضرت ﷺ تک جا پہنچتا ہے۔ [3]

خود لکھتے ہیں:

"میں نہایت ناچیز ہوں۔ مگر اس رسول ﷺ کی ذرّیت میں ہوں، جو رحمۃ اللعالمینؐ تھے۔" [4]

بنو اُمیہ اور بنو عباس کے دور میں سر سیّد کے آبا و اجداد عرب سے ہجرت کر کے ایران کے قدیمی شہر دامغان میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ پھر ہرات جا بسے۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ سیّد محمد دوست جو سر سیّد سے پانچ پشت اُوپر ہیں، دکن کی مہمات میں اورنگ زیب عالمگیر کے جرنیلوں میں تھے۔ بعد میں اورنگزیب نے انہیں ہرات کا صوبیدار (گورنر)

مقرر کر دیا۔ سرسیّد کے دادا سیّد ہادی کو عالمگیر ثانی نے جواد علی خان کا خطاب دیا اور اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔ عالم گیر ثانی کے بعد شاہ عالم بادشاہ نے انہیں جواد الدولہ کا مزید خطاب عطا کیا اور عہدۂ احتساب وقضاان کے سپرد کیا۔

سرسیّد اپنے دادا کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''سیّد ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور اُن کا پورا دِیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا، جو غدر کے زمانے میں تلف ہوگیا۔''[5]

سرسیّد کے والد میر محمد متقی کو بھی شاہ عالم اور پھر اس کے بعد اکبر شاہ ثانی کے عہد میں وہی خطاب اور منصب پیش کیا گیا، جس پر سرسیّد کے دادا سیّد ہادی فائز تھے مگر ایک تو میر متقی آزاد طبیعت اور درویش منش انسان تھے، دوسرے مغل بادشاہوں میں اب اتنی سکت نہ تھی کہ خطاب وعہدہ کے مطابق باقی لوازمات بھی مہیا کر سکتے۔ مغل بادشاہت اب لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، میر متقی نے خطاب اور منصب قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ اس کے باوجود وہ اکبر شاہ کے مقربینِ خاص میں تھے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جملہ درباریوں میں بادشاہ کے حضور بیٹھنے کی اجازت صرف انہیں ہی حاصل تھی۔ اس سے سرسیّد احمد خان کے والد گرامی اور ان کے خانوادے کی عزت وتکریم اور حیثیت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میر متقی تیر اندازی اور تیراکی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ دہلی کے اکثر ماہر تیر انداز ان کے شاگرد تھے۔ سرسیّد احمد خان نے تیراکی اور تیر اندازی اپنے والد سے ہی سیکھی۔

سرسیّد کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ بڑے صاحبِ علم وفضل اور بلند اقبال شخصیت تھے۔ ریاضیات، زیچ اور آلاتِ رصد کے علوم میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ سرسید کے قول کے مطابق ''خواجہ فرید کے تصنیف کئے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علمِ ہیئت اور آلاتِ رصد کے باب میں تھے جو ایامِ غدر میں ضائع ہوگئے۔ مگر ان میں سے تین رسالے خود انہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خلیفہ سیّد محمد حسن مرحوم وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں، جن کو مدرسۃ العلوم کے کتب خانہ میں شامل کر دیا ہے۔''[6]

خواجہ فرید الدین احمد کی شخصی وجاہت اور سیاسی بصیرت اس پائے کی تھی کہ گورنر جنرل ولزلی نے

انہیں اپنا سفیر بنا کر ایران بھیجا۔ 1815ء میں اکبر شاہ ثانی نے انہیں اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کے خطابات سے نوازا۔ کئی سال تک خواجہ فرید اس عہدے پر فائز رہے اور اپنی دانش مندانہ تدبیروں سے بادشاہ کے مالی مسائل حل کئے اور شاہی دربار کو قرضے کے بوجھ سے نجات دلائی۔ ان کے حسنِ تدبیر اور ان کی انتظامی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اُس وقت کے پنجاب کے فرماں روا مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خواجہ فرید الدین احمد کو وزارت کا عہدہ پیش کیا اور اپنے خاص معتمد کے ہاتھ تیس ہزار روپے سفر خرچ بھیجا اور ان کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ مگر خواجہ صاحب نے بوجوہ یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 1828ء میں خواجہ فرید خالق حقیقی سے جا ملے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے منصب وزارت کی پیشکش خواجہ فرید الدین احمد نے اپنی بڑی بیٹی، عزیز النساء بیگم، جو سر سیّد احمد کی والدہ ماجدہ تھیں، کے مشورے پر قبول نہ کی۔ سر سید احمد خان کی والدہ بڑی دانش مند اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔ اس واقعہ سے متعلق سر سیّد احمد خان کا بیان، جس سے ان کی والدہ کے فہم و بصیرت کا پتہ چلتا ہے، اس قابل ہے کہ اسے یہاں من و عن نقل کیا جائے:۔

> ''مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا معتمد اور تیس ہزار روپیہ بطور سفر خرچ دبیر الدولہ کے پاس بھیجا اور لاہور بلایا۔ سب لوگوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ منظور کر لیں مگر ان کی بڑی بیٹی یعنی والدہ راقم نے کہا کہ ''خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح پر چاہیں آپ آرام کر سکتے ہیں اور اگر اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی جو آرام و آسائش آپ کو اب ہے، اس میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ خود لاہور میں جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات لینا اور ہم سب کا انگریزوں کی عملداری میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیا اتفاقات پیش آئیں، کیا انقلابات ہوں اور کس قسم کی مشکلات پیش آ جائیں۔ پس اس زمانۂ ضعیفی میں کہ آپ کی طبیعت بھی علیل رہتی ہے، وہاں جانا میں پسند نہیں کرتی۔'' دبیر الدولہ کے دل پر اس بات نے ایسا اثر کیا کہ جانے سے انکار کر دیا۔''[7]

سر سیّد کی والدہ ماجدہ غیر معمولی سیرت و کردار کی مالک تھیں۔ وہ بڑی راسخ العقیدہ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بڑی صحیح العقیدہ مسلمان تھیں۔ سر سیّد نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد خان کی جو سوانح،

سیرت فریدیہ کے نام سے لکھی ہے، اس میں اپنی والدہ کے بارے میں بھی کافی معلومات دی ہیں۔ اپنی والدہ کے فہمِ دین کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں، اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا۔"[8]

سرسیّد کی عظیم شخصیت اور بے مثل سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر میں زیادہ تر ان کی والدہ کی تربیت کا حصہ ہے۔ ان کے والد میر متقی تو ایک آزاد منش اور درویش صفت انسان تھے اور زیادہ وقت اپنے مرشد حضرت شاہ غلام علی کی خانقاہ میں گزارتے اور ان کی صحبت میں رہتے تھے۔ گھر کا سارا انتظام و انصرام سرسیّد کی والدہ کے سپرد تھا۔ سرسیّد کی طبیعت اور مزاج پر اپنی والدہ کی عادات و خصائل کا اثر تھا۔ اس لئے چند ایسے اقتباسات کا دینا بے جا نہ ہوگا جو ان کی والدہ کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ تاکہ پتہ چل سکے کہ سرسیّد کی تربیت کس ماحول میں ہوئی اور وہ کون سے عناصر تھے جن سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی۔ حیاتِ جاوید میں الطاف حسین حالؔی لکھتے ہیں کہ "سرسیّد سے ایک دفعہ ان کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ میری تمام سرگذشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔"

"طفلی و دامانِ مادر، خوش بہشتی بودہ است
چوں بپائے خود رواں گشتیم سر گرداں شدیم"

حالؔی لکھتے ہیں کہ سرسیّد کی والدہ میں اولاد کو تربیت دینے کا خدا داد ملکہ تھا۔ اس امر کا بخوبی اندازہ سرسیّد کی اپنی تحریروں سے لیے گئے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوتا ہے۔ اپنی والدہ کے بارے میں بتاتے ہیں:۔

"جب میں ان کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں باندھ رکھی تھیں، اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر ان سوت کی لڑوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔"

"جس زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی۔ میں نے ایک نوکر کو جو بہت

پرانا اور بوڑھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو انہوں نے نہایت ناراض ہوکر کہا، اس کو گھر سے نکال دو جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماماں میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لاکر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماماں نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی۔ انہوں نے کہا۔ "دیکھو آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں۔ وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں۔ انہوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کردوں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جا کر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔"

"سرسیّد کا بیان ہے کہ میرے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینے تک یہی حال رہا جب ان کا انتقال ہو گیا تو سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہوگیا۔ انہوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق تک مصلے پر ہی بیٹھی رہیں۔ انہی دنوں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تمام سامان شادی کا ہو چکا تھا۔ صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی رہتے تھے۔ جب یہ حادثہ ہم پر گزرا تو ان لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی۔ میری والدہ نے جب سنا تو اس واقعہ کے تیسرے دن ان کے گھر گئیں اور کہا میں شادی میں آئی ہوں۔ ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا۔ جو خدا کو منظور تھا، ہو چکا۔ تم شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو جب کہ میں خود تمہارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟"

سرسیّد احمد خان کہتے ہیں کہ "جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ فی صد کے حساب سے میری والدہ ہمیشہ الگ رکھتی جاتی تھیں اور اس سرمایہ کو حسنِ انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں۔ کئی جوان لڑکیوں کا ان کی امداد سے نکاح ہوا۔ اکثر پردہ پوش عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں ان کی ہمیشہ خبر

گیری کرتیں۔ غریب خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں ان کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں۔ دوسرے نکاح کو برا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں۔ غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلہ سے ان کی مدد کر آتیں۔ بعض رشتہ دار مردوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کر لیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر وہ ان کے گھر برابر جاتیں اور ان کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔''

''میری تمام ننھیال کو شاہ عبد العزیز اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی شاہ صاحب کے ہاں منت اور نذر نیاز کا کہیں پتہ نہ تھا ان کی عادت تھی کہ جب کوئی اپنی حاجت لے جاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دُعا کرو۔ خدا اس کی حاجت پوری کرے۔ یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔ انہوں نے خود کوئی منت یا نذر نیاز کبھی نہیں مانی تعویذ یا گنڈے پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت یا نحوست پر ان کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی کرتا تو اس کو منع بھی نہ کرتیں اور یہ کہتیں کہ اگر ان کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خوف سے وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کو یقین ہو جائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا، اگر ایسا کیا جاتا تو نہ ہوتا۔''

''میرے ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے مگر شاہ عبد العزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے ہاں کے اور بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس بچے کو دیا جاتا تھا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈہ یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سیّد حامد اور سیّد محمود (سر سیّد کے صاحبزادوں) کو بھی ان کی ننھیال والوں نے گنڈے پہنائے تھے باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں انڈہ یا مرغی ہوتی وہ بلا تامل ان کو کھلا دیتیں۔''

سر سیّد لکھتے ہیں:۔

''بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہیں آ رہیں تو باوجودیکہ اس حویلیمیں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان میں تھی، جب کبھی میں ان کی

حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اسی لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔''[9]

حالیؔ لکھتے ہیں:۔

''بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود ان کے ماموں ان کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے...... ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمہارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ ابتداء میں وہ اکثر گیند بلا، کبڈی، آنکھ مچولی وغیرہ کھیلتے تھے۔''[10]

سرسیدؔ کو ان کی ایک خادمہ نے پالا تھا جسے وہ ماں بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ انہیں ماں بی بی سے بہت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ ماں بی بی کا انتقال ہوگیا۔ سرسیدؔ لکھتے ہیں: ''مجھے خوب یاد ہے ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھیں۔ جب وہ مرگئی تو مجھے اس کے مرنے کا بہت رنج ہوا۔'' میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ ''وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بڑے آرام سے گزرتی ہے۔ تم کچھ رنج مت کرو۔'' مجھ کو ان کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سیدؔ کا ہے مگر میری والدہ اس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ''اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں۔'' میں نے کہا ''ہاں بھیج دو۔'' والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔''

سرسیدؔ کا بیان ہے کہ ''میں جب دلی میں مُنصف تھا تو میری والدہ کی یہ نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضرور ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو، زمانے کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اسے نباہ سکو۔ چناں چہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے

کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا۔''

اپنی والدہ کی نیک دلی کا ایک اور واقعہ سرسیّد یوں بیان کرتے ہیں:۔

''مسماۃ زے بن ایک لاوارث بڑھیا تھی۔ میری والدہ اس کی خبر گیری کرتی تھیں۔ جب میں دلی میں مُنصف تھا تو اتفاق سے میری والدہ اور زے بن ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ایک ہی تھی۔ حکیم نے والدہ کے لئے کسی قدر افاقہ کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا تجویز کیا مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روز کی خوراک تھی۔ میں اس معجون کو تیار کرا کے والدہ کے پاس لے گیا اور ان سے کہہ دیا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ انہوں نے لے لی۔ مگر اس خیال سے کہ یہ زے بن کو بھی مفید ہوگی، لیکن اس کو کون بنوا کے دے گا، انہوں نے خود اس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زے بن کو کھلاتی رہیں۔ زے بن کو اس سے بہت فائدہ ہوا۔ مگر والدہ بھی بغیر اس معجون کے استعمال سے اچھی ہوگئیں۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسیں اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا؟ آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زے بن ہی نے کھائی مگر خدا نے دونوں کو صحت عطا کی۔''

اس ضمن میں مزید ایک اور واقعہ کا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سرسیّد کے الفاظ میں

''جب میں صدر امین تھا تو ایک شخص کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اس کو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا مگر ایک مدت کے بعد اس نے در پردہ میرے ساتھ برائی کرنی شروع کر دی اور مدت تک میری شکایت کی گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا آخر تمام وجہ ثبوت جس سے اس کو کافی سزا مل سکتی تھی، میرے ہاتھ آگئی اور اتفاق سے اس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اس کے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو اور اگر بدلہ ہی لینا چاہتے ہو تو اس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی

کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دُنیا کے کمزور حاکموں سے بدلہ دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے۔ ان کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اس دن سے آج تک مجھ کو کبھی کسی دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور امید ہے کہ کبھی نہ آئے گا بلکہ انہی کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اُس سے میرا بدلہ لے۔''[11]

مندرجہ بالا اقتباسات حیات جاوید حصہ اوّل سے لیئے گئے ہیں۔ جو حالؔی کے بقول اُنہوں نے کچھ تو سر سیّد کی تصنیف سیرت فریدیہ سے لیے ہیں اور کچھ سر سیّد اور ان کے رشتہ داروں سے مروی ہیں:۔

سر سیّد اپنی بہن صفیۃ النساء بیگم اور بھائی سیّد محمد خان سے چھ سال بعد پیدا ہوئے اس لیے ان کی ولادت پر سب کو بڑی خوشی ہوئی۔ شاہ غلام علی نے جو ان کے والد میر محمد متقی کے پیر و مرشد تھے ان کا نام احمد خان رکھا۔ بڑے بھائی محمد خان کا نام بھی انہی کا تجویز کردہ تھا۔ وہ پیدائش کے وقت ہی بڑے تندرست اور صحت مند تھے۔ عام بچوں کے مقابلے میں ان کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے لگتے تھے۔ جب ان کے نانا کلکتہ سے دلی آئے اور سر سیّد کو پہلی بار دیکھا تو کہا ''یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے۔''

سر سیّد اپنے بچپن کے زمانے میں بڑے صحت مند اور مستعد تھے۔ وہ بعض اوقات شوخی اور شرارت سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ ایک دفعہ کھیل کود میں انہوں نے اپنے ایک ہم جولی کو مکا دے مارا اس نے ہاتھ پر روکا تو اس کی انگلی اُتر گئی۔ سر سیّد بچپن میں پڑھائی لکھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے، نہ انہوں نے تعلیم کے دوران کسی غیر معمولی ذہانت یا طباعی کا مظاہرہ کیا۔ بہر حال وہ اپنا سبق باقاعدگی سے یاد کرتے تھے۔ گھر میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا اور خاص کر ان کی والدہ اور ان کے نانا ان کی تدریس و تعلیم کا خیال رکھتے تھے۔ سر سیّد بتاتے ہیں:۔

''شام کو چراغ جلنے کے بعد (نانا کے) پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے۔ جس کو سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھر ک دیتے۔''[12]

گھر کا ماحول ایسا تھا کہ تہذیب و شائستگی اور مجلسی زندگی کے آداب اس ماحول کا طرۂ امتیاز تھے۔ اپنے

نانا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا ذکر سر سیّد اس طرح کرتے ہیں:

''میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانہ میں کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لیکر اپنے ہاتھ سے اس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے۔ ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانے میں کھاتے تھے۔ ہم سب لڑکے ان کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ نہایت سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہوتا تھا۔ کسی کے پاؤں کا دھبا سفید چاندنی پر لگ جاتا تو اس کو بھگا دیتے تھے کہ گنتے کے پاؤں کیوں رکھتا ہے؟ روشنائی وغیرہ کا دھبا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا تو اس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔''[13]

سر سیّد کی طبیعت میں شوخی اور خود اعتمادی بچپن سے ہی تھی۔ سیرت فریدیہ میں سر سیّد ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں ان کے نانا مغل بادشاہ کے وزیر اعظم تھے۔ جنرل آکٹر لونی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے دہلی میں تعینات تھے، ان کے نانا سے ملاقات کرنے اکثر ان کی حویلی آیا کرتے تھے۔ ایک دن سر سیّد نانا کے ہاں گئے تو دیکھا کہ جنرل آکٹر لونی فُل ڈریس یعنی پوری وردی زیب تن کیے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے بڑے تعجب اور دلچسپی سے جنرل آکٹر لونی کو دیکھا اور ان سے پوچھنے لگے کہ'' آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دوہرے بٹن کیوں ہیں؟'' جنرل آکٹر لونی سر سیّد کے ان سوالات سے بڑے محظوظ ہوئے۔ اس وقت سر سیّد کی عمر پانچ چھ سال کے لگ بھگ تھی۔

ہر سال تاریخِ جلوس یعنی تخت نشینی کی سالگرہ کے موقع پر بادشاہ اکبر ثانی کی طرف سے دوسرے عمائدینِ سلطنت کی طرح سر سیّد کے والد محمد متقی کو پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ مگر اخیر میں میر متقی اپنی درویشی کے سبب دربار میں خود حاضر نہیں ہوتے تھے اور انہوں نے یہ خلعت سر سیّد کو دلوانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سر سیّد کی عمر آٹھ نو برس تھی مگر ڈیل ڈول کے لحاظ سے وہ اپنے ہم عمروں میں کہیں بڑے لگتے تھے۔ ایک دفعہ تاریخِ جلوس کے جشن کے موقع پر سر سیّد صبح وقت پر دربار میں نہ پہنچ

سکے۔ بادشاہ نذرانے وصول کر کے اور خلعتیں تقسیم کر کے تخت پر سے اُٹھ کر جا چکا تھا۔ تخت سے اُٹھ کر تسبیح خانے کی طرف جاتے ہوئے بادشاہ کی نظر سرسیّد پر پڑی۔ داروغہ نے سرسیّد سے کہہ دیا تھا کہ اب بادشاہ کے حضور حاضری کا وقت نہیں رہا۔ مگر تسبیح خانہ میں پہنچ کر بادشاہ نے خود سرسیّد کو طلب کر لیا اور جواہر خانہ کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے سرسیّد کو اپنے سامنے بلایا اور بڑی شفقت سے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا ''دیر کیوں کی؟'' حاضرین نے کہا ''عرض کرو تقصیر ہوگئی۔'' مگر سرسیّد خاموش کھڑے رہے جب بادشاہ نے دوبارہ پوچھا تو کہنے لگے ''سو گیا تھا۔'' بادشاہ یہ سن کر مسکرا دیا اور فرمایا ''بہت سویرے اُٹھا کرو۔'' بادشاہ نے جواہرات کا ہار پہنایا اور سرسیّد نے اس کے حضور نذر پیش کی۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسیّد میں نہ صرف خود اعتمادی بلا کی تھی بلکہ عزتِ نفس اور خودداری بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔

سرسیّد میں اظہار و بیان کا جو ایک قدرتی جوہر تھا اور جو بعد میں ان کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کا ایک وصفِ خاص بن کر سامنے آیا اس کی ایک جھلک ان کے ابتدائی زمانہ تعلیم کے اس دلچسپ واقعے میں دکھائی دیتی ہے جو انہوں نے سیرتِ فریدیہ میں بیان کیا ہے۔ سرسیّد ایک دن اپنے نانا حضور کو بوستان کا سبق سنا رہے تھے۔ اس مصرعے پر پہنچے۔ ع طمع را سہ حرف است، ہر سہ تہی۔ تو اس کا ترجمہ سرسیّد نے یہ کیا کہ ''طمع کے تین حرف تینوں خالی۔'' نانا نے ''ہونہہ'' کہا۔ سرسیّد سمجھے شاید غلط کہہ دیا۔ پھر مصرع پڑھا۔ پھر یہی ترجمہ کر دیا نانا نے پھر ٹوکا۔ انہوں نے پھر وہی ترجمہ کیا کہ ''طمع کے تین حرف، تینوں خالی۔'' وہ خفا ہو کر بولے ''بے پیر سبق یاد نہیں کرتا۔'' کہتے ہیں مجھ کو اتنا رنج ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بعد میں انہیں خیال آیا کہ انہوں نے است کا ترجمہ نہیں کیا یعنی پورا فقرہ نہیں بولا کہ طمع کے تین حرف ہیں تینوں خالی۔ مگر دیکھا جائے تو جو ترجمہ سرسیّد کی زبان سے بے ساختہ نکلا تھا کہ ''طمع کے تین حرف، تینوں خالی۔'' تو حقیقت یہ ہے کہ یہ ترجمہ زیادہ فصیح اور اُردو محاورے کے زیادہ قریب ہے اور یہی بہتر ترجمہ ہے۔ است کا ترجمہ کرنے سے تاثر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

سرسیّد کی تعلیم کا آغاز گھر پر ہی ہوا۔ بسم اللہ قرآنِ حکیم سے ہوئی۔ انہوں نے اپنی والدہ سے اور ایک استانی سے جو اُن کے خاندان کے بچوں کو پڑھایا کرتی تھی، پڑھنا سیکھا پھر فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ گلستان اور بوستان کے مطالعے میں بھی ان کی والدہ ان کی مدد کرتی رہیں۔ جب ذرا

آگے بڑھے تو باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمید الدین ان کے اتالیق تھے۔ پڑھنے لکھنے میں کچھ استعداد پیدا ہوئی تو اپنے ننھیال کے خاندانی تشخص، علمِ ریاضی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپنے ماموں نواب زین العابدین خان سے ریاضی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر آلاتِ رصد کے علوم کی تحصیل کا شوق ہوا۔ حکیم غلام حیدر خان ان کے خاندانی حکیم تھے۔ اُن کی صحبت میں علمِ طب میں دلچسپی لینے لگے۔ طب کی ابتدائی کتابیں ان سے پڑھیں اور کچھ عرصہ حکیم صاحب کی شاگردی میں طبابت کا تجربہ بھی حاصل کیا۔ مگر یہ دلچسپی بھی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ حالی لکھتے ہیں کہ اٹھارہ انیس سال کی عمر تک باقاعدہ حصولِ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد طبیعت کے رجحان اور افتادِ طبع کے مطابق اگرچہ اپنے شوق سے مختلف کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہیں، مگر علم کے کسی خاص شعبے میں کوئی قابلِ لحاظ قابلیت پیدا کرنے کا خیال ان کو نہیں آیا۔ البتہ دہلی کی علمی و ادبی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع انہیں اکثر ملتا رہتا تھا۔ اہلِ علم و ادب سے ان کی ملاقات رہتی تھی۔ اس وقت کے مشہور شعراء اور ادباء میں میرزا غالبؔ، مفتی صدر الدین خان آزردہ اور امام بخش صہبائی کے ہاں ان کا آنا جانا تھا۔ میرزا غالبؔ سیّد احمد پر بطورِ خاص شفقت فرماتے تھے۔ سر سیّد کو بھی میرزا سے دلی عقیدت تھی۔ ان کو چچا جان کہہ کر مخاطب کرتے۔

سر سیّد احمد خان کی بزرگانہ عظمت اور سنجیدہ وجاہت کی یہ جو تصویر آج ہم دیکھتے ہیں، اس سے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ آغازِ شباب میں کتنے بانکے اور سجیلے تھے۔ اگرچہ ایک مقناطیسی کشش اور شخصی جاہ و جلال بڑھاپے میں بھی ان کے اندر موجود تھا اور جو شخص ان کو پہلی بار دیکھتا تھا، دیکھتا رہ جاتا تھا۔ مگر جن دنوں وہ لڑکپن سے نکل کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے، حسن و جمال کا پیکر تھے۔ نہایت گورا چٹا رنگ، لمبا چوڑا قد بت، بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں، پھر خاندانی طور پر دہلی کی اشرافیہ کے چشم و چراغ، حسینی سیّد۔ جہاں جاتے لوگ آنکھیں بچھاتے سعدی نے کیا خوب کہا تھا۔ ''در عنفوانِ جوانی چنانکہ افتد دانی'' یعنی نوجوانی میں جو کچھ گزرتی ہے جانتے ہو؟ سیّد احمد خان کی نوجوانی بھی رنگین صحبتوں میں گزری۔ وہ میلے ٹھیلوں اور باغوں کی سیر دیکھنے کا بہت شوق رکھتے تھے۔ بسنت اور ہولی کے تہوار خوب مناتے۔ خود ان کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر بسنت کا میلہ لگتا تھا۔ سیّد احمد اس کے اہتمام میں آگے آگے ہوتے۔ ساز و آواز کی محفلوں میں جایا کرتے۔ خواجہ میر درد مرحوم کے سجادہ نشین ان کی یاد میں ہر مہینے کی چوبیسویں رات کو حال و قال کی ایک مجلس برپا کرتے۔ سیّد احمد خان اپنے بھائی سیّد محمد خان اور ماموں نواب زین

العابدین خان کے ہمراہ وہاں جایا کرتے۔ خود ان کے ماموں کے ہاں موسیقی کی محفلیں جمتیں۔ بڑے بڑے مشہور و معروف گوّیے ان محفلوں میں دھرپت اور خیال کے جلوے دکھایا کرتے۔ اس زمانے میں خواجہ محمد اشرف، دہلی کے ایک معروف بزرگ اور رئیس تھے۔ بسنت پر وہاں تقریب ہوتی۔ شہر کے خواص کو مدعو کیا جاتا۔ بسنت کی نسبت سے سارا ماحول زرد رنگ میں رنگا ہوتا۔ نامی گرامی طوائفیں زرد رنگ کا زرق برق چست لباس پہن کر آتیں۔ جو فرش بچھایا جاتا اس کا رنگ بھی زرد ہوتا۔ صحن کے حوض میں زرد پانی اور باغیچے میں زرد پھول بہار دکھا رہے ہوتے۔ سرسیّد احمد خان اپنے بڑے بھائی سیّد محمد خان کو ساتھ لیے ہمیشہ وہاں موجود ہوتے۔ دونوں بھائیوں میں بے پناہ محبت تھی۔ سیّد محمد خان کہا کرتے تھے کہ جس محفل میں سیّد احمد نہ ہوں وہاں بیٹھنے میں مزا نہیں آتا۔ شہر میں کسی رئیس کے ہاں جہاں کوئی بزمِ نشاط آراستہ ہوتی دونوں بھائی وہاں جا پہنچتے۔ سرسیّد بڑھاپے میں جس قدر بذلہ سنج تھے۔ جوانی میں اتنے ہی شوخ و شریر تھے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی حاضر جوابی تھی۔ ایسے جملے چُست کرتے کہ لوگوں کے ذہن پر نقش ہو جاتے۔ بار بار ایک دوسرے کو سنا کر لطف اندوز ہوتے۔ شیریں جان ایک خوبصورت رقاصہ اور گانے والی تھی جو دہلی کی محفلوں کی جان تھی۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اس کی ماں اتنی ہی بدصورت کالی کلوٹی اور بھدی تھی۔ ایک محفل میں اس کی ماں کو دیکھ کر کسی نے کہا "مادرش بسیار تلخ است" (اس کی ماں بڑی کڑوی کسیلی ہے) سرسیّد بے ساختہ بول اٹھے "اگرچہ تلخ است و لیکن بر شیریں دارد۔" (ہاں اگرچہ تلخ ہے مگر اس کا پھل بڑا شیریں ہے) یہ فقرہ دہلی کی محفلوں میں ایک مدت تک چلتا رہا اور لوگ خوش وقت ہوتے رہے۔ اسی طرح کی کسی محفل میں ایک حسین و جمیل اور چلبلی طوائف، نازو جان محوِ رقص تھی۔ اس کی نظر سرسیّد پر پڑی تو وہیں ٹھہر گئی۔ وہ بار بار ان کی طرف لپکتی اور ان کے سامنے آ کر ناچتی۔ مسکرا مسکرا کر سیّد احمد کی بلائیں لیتی رہی۔ سیّد کی صورت اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے داد و تحسین کے الفاظ اس کے دل میں اُتر گئے وہ ان پر ایسی ریجھی کہ پیچھے ہی پڑ گئی۔ درگاہوں پر جاتی، فقیروں سے دعائیں کرواتی، منتیں مانتی، نیازیں دیتی کہ سیّد اس کا ہو جائے۔ سرسیّد کو خط بھیجتی۔ ایک دن سرسیّد نے اس کے خطوط اپنے بھائی کے آگے رکھ دیئے۔ انہوں نے دیکھ کر کہا "وہ تو تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟" سیّد احمد بولے "میرا ارادہ کبھی بنتا ہے کبھی نہیں۔" نازو جان کچھ دن تک ان کے دل و دماغ پر چھائی رہی لیکن آخر انہوں نے ہمت کر کے اس کا خیال ہمیشہ کے

لیے دل سے نکال دیا۔ حالی نے مندرجہ ذیل اقتباس میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''باوجود نہایت دل بستگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی، سر سیّد نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو ان کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیئے۔''[14]

سر سیّد نے ان دنوں کی یاد میں لکھا ہے:۔

''ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے۔''[15]

☆میر تقی میر کے اس مشہور شعر کا پہلا مصرع مرجہ دوانین میں یوں آیا ہے: ''دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب'' مگر سر سیّد احمد خان نے اپنی تحریر میں اسے اسی طرح لکھا ہے۔

ملازمت

1838ء میں جب سرسیّد کے والد کا نتقال ہوا تو انہیں ملازمت کرنے کا خیال آیا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس سال کے لگ بھگ تھی۔ لال قلعے سے ان کا تعلق موروثی تھا ان کے والد کو ساری عمر وہاں سے وظیفہ ملتا رہا۔ اگر وہ خواہش کرتے تو مغل بادشاہ ان کے لیے کوئی مناسب جگہ پیدا کر دیتا مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ مغل بادشاہ خود اب چراغ سحری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ انہوں نے لال قلعے سے قطع تعلق کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کی ملازمت کو ترجیح دی۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خان کمپنی کی طرف سے دہلی میں صدر امین تھے۔ اپنی والدہ کے مشورے پر سرسیّد نے ان کے دفتر جا کر کام سیکھنا شروع کر دیا۔ چند ہی دنوں میں وہاں سررشتہ دار کی آسامی خالی ہونے والی تھی۔ جب پرانا سررشتہ دار ریٹائرڈ ہوا تو اس کی جگہ سرسیّد کو مل گئی۔ ابھی چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ دہلی کے سیشن جج مسٹر رابرٹ ہیملٹن نے سرسیّد کو سیشن کورٹ میں سررشتہ دار لگانا چاہا مگر سرسیّد ابھی اپنے آپ کو اس کام کا پوری طرح اہل نہیں سمجھتے تھے رابرٹ ہیملٹن کے سرسیّد کے خاندان سے پرانے تعلقات تھے۔ اس نے کہا کہ ہم تم سے کوئی مشکل کام نہیں لیں گے مگر سرسیّد نے اس بنا پر معذرت کر لی کہ وہ ابھی کام سیکھ رہے ہیں۔ 1839ء میں رابرٹ ہیملٹن آگرہ کے کمشنر بن گئے۔ انہوں نے اصرار کر کے سرسیّد کو فوراً اپنے پاس بُلا لیا اور اپنے دفتر میں نائب منشی کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ اس دفتر میں قوانین مال سے ان کی واقفیت ہوئی۔ اس زمانے میں آگرہ کے کچھ ضلعوں میں بندوبستِ اراضی کا کام ہو رہا تھا۔ سرسیّد نے خوب دل لگا کر کام سیکھا۔ اپنے استفادے کے لیئے انہوں نے دیوانی قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ جس میں محکمۂ مال میں عام استعمال ہونے والے قوانین اور بندوبستِ اراضی کے قواعد وضوابط آسان انداز میں مرتب کیے۔ رابرٹ ہیملٹن کمشنر آگرہ نے جب یہ کتابچہ دیکھا تو سرسیّد کی لیاقت اور کام کرنے کی لگن سے متاثر ہوا۔ اس نے اس کی ایک نقل لیفٹیننٹ گورنر کو بھیجی اور سفارش کی کہ سیّد احمد کو منصف کے

عہدے پر تعینات کیا جائے۔ انہی دنوں انگریزی سرکار نے منصفی کی آسامیوں کے امیدواروں کے لیئے ایک امتحان تجویز کیا۔ سرسیّد پہلی کوشش میں ہی کامیاب ہوگئے۔ اگلے سال ان کے بھائی سیّد محمد نے بھی سرسیّد کے تیار کردہ اسی خلاصے کی مدد سے منصفی کا امتحان پاس کرلیا۔ یہ خلاصہ قوانین، منصفی کے امتحان کے امیدواروں کے لیئے بڑا مجرب نسخہ ثابت ہُوا اور ملازمت کے متلاشی نوجوانوں نے اس کو حرزِ جان بنا لیا۔ یہ خلاصہ سرسیّد نے بعد میں ''انتخاب الاخوین'' (یعنی دو بھائیوں کا انتخاب کیا ہوا) کے نام سے چھاپ دیا اور بڑے بھائی کا نام بھی بطور مصنف و مرتب اپنے نام کے ساتھ بلکہ اپنے نام سے پہلے سرِ ورق پر لکھوایا۔ بڑے بھائی سے ان کو بے حد محبت تھی۔ وہ بھی دِل و جان سے ان کو چاہتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی انتخاب الاخوین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لیئے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبوں میں شائع ہوگیا۔ بہت سے امیدوار اسی کی بدولت منصف ہو گئے۔ 1884ء میں انجمن اسلامیہ لاہور نے سرسیّد کو ان کے لاہور آنے پر استقبالیہ دیا۔ اس موقع پر سپاس نامے میں بطورِ خاص سرسیّد کے اس احسان کا ذکر کیا گیا۔ یہ خلاصہ سرسیّد نے محض اپنی یادداشت اور استفادے کے لیئے مرتب کیا تھا یہ خیال نہ تھا کہ اسے باقاعدہ تصنیف کے طور پر دوسروں کے سامنے بھی پیش کریں گے۔ مگر یہ رسالہ بڑا مقبول ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسیّد میں تحریر و بیان اور تصنیف و تالیف کی قدرتی اہلیت تھی۔ ملازمت میں آنے سے پہلے وہ اپنے بھائی سیّد محمد خان کے اخبار ''سیّد الاخبار'' میں لکھا کرتے تھے۔ تحریر و تصنیف کا یہ سلسلہ 1898ء میں ان کی وفات تک یعنی برابر 60 سال جاری رہا۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی فارسی زبان میں امیر تیمور سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ ظفر تک 43 بادشاہوں کی فہرست اور ان کا مختصر حال ہے جو انہوں نے جامِ جم کے نام سے 1840ء میں لکھا۔

سرسیّد 10 جنوری 1842ء کو فتح پور سیکری میں منصف مقرر ہوئے۔ یہ وہی شہر ہے جو جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے بسایا تھا اور جو ایک عرصہ تک اس کا دار السلطنت رہا۔ اکبر بادشاہ کی خواب گاہ جس عالی شان مکان میں تھی وہی مکان سرسیّد کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر ملا جہاں چار سال تک سرسیّد کا قیام رہا۔ اسی قیام کے دوران آگرہ کے مشہور عالمِ دین مولانا نور الحسن سے سرسیّد کی صحبت رہی۔ بعض روایات کے مطابق سرسیّد نے باقاعدہ ان کی شاگردی اختیار کی اور دینی علوم میں ان سے اکتساب کیا۔

مولانا نورالحسن نے سرسیّد احمد خان کو شاہ عبدالعزیز کی شیعیت پر نہایت عالمانہ کتاب ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کے دسویں اور بارہویں باب کے ترجمے پر راغب کیا۔ اس دوران سرسیّد نے تین رسالے لکھے۔ پہلا رسالہ جلاء القلوب بذکر المحبوب کے نام سے طبع ہوا۔ یہ رسالہ سرسیّد نے مولود کی مجلسوں کے لیے لکھا اور صحیح روایتوں سے اس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت، معجزات، مختصر حالات اور ان کے وصال مبارک کا حال بیان کیا۔ یہ رسالہ اس خیال سے لکھا کہ میلاد کی محفلوں میں اس وقت پڑھے جانے والے عام کتابچے صحیح روایات پر مبنی نہ تھے اور ان میں بہت سی بے بنیاد اور توہم پرستانہ باتیں راہ پا گئیں تھیں۔ دوسرا رسالہ تحفۂ حسن کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں سرسیّد نے اس ناروا اور بے جواز طعن و تشنیع کا جواب لکھا۔ جو اہلِ تشیع حضرت صدیقِ اکبرؓ پر کرتے ہیں اور تولا اور تبرا پر عقلی نکتہ چینی کر کے ان کی اصلیت واضح کی۔ تیسرے کتابچے کا نام تسہیل فی جرالثقیل ہے یہ ایک عربی رسالے کا ترجمہ ہے جس میں مصنف نے جرثقیل کے پانچ اصولوں کی وضاحت کی ہے۔

سرسیّد احمد خان کی ابتدائی مذہبی تحریروں سے دو موضوعات بطورِ خاص سامنے آتے ہیں۔ ایک تو مسلمان ہونے کے نقطۂ نظر سے فرد اور معاشرے کی زندگی میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی مرکزی حیثیت کا از سرِ نو تعین اور دوسرے ان بدعتوں کا قلع قمع کرنے کی خواہش جو غیر اسلامی اثرات کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی میں رسم و رواج کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔

1842ء میں حکیم احسن اللہ خان آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے وزیرِ اعظم تھے۔ بادشاہت اگرچہ لال قلعہ کی چاردیواری میں مقید ہو کر رہ گئی تھی مگر خطابات والقابات کا وہی عالم اور رنگ ڈھنگ چلا آتا تھا۔ حکیم احسن اللہ خان نے بادشاہ کے حضور سرسیّد کی تعریف کی اور کہا کہ جو خطاب دربارِ مغلیہ سے ان کے دادا کو عطا ہوا تھا وہی خطاب سرسیّد کو دینا چاہیئے۔ بادشاہ نے یہ تجویز بخوشی منظور کر لی۔ سرسیّد کو دربار میں طلب کیا گیا اور بادشاہ نے ان کو جوادالدولہ سیّد احمد خان عارف جنگ کا خطاب عنایت کیا۔ اس وقت وہ فتح پور سیکری میں منصف تھے۔

1846ء کے آغاز میں ان کے بڑے بھائی سیّد محمد خان چند روز بیماری میں مبتلا رہ کر وفات پا گئے۔ یہ حادثۂ جانکاہ ان کی والدہ پر تو جیسا بھاری گزرا ہوگا ظاہر ہے مگر سرسیّد بھی بھائی کی موت کے غم سے نڈھال ہو گئے۔ انہوں نے فتح پور سیکری سے اپنا تبادلہ دلی کرا لیا۔ کم ہی کسی کو اپنے بھائی سے اتنی

محبت ہوگی جتنی سرسیّد کو تھی۔ یوں ہنستے کھیلتے ان کے بھائی کا یکایک موت کی آغوش میں چلے جانے کا سانحہ ایسا تھا جس نے سرسیّد کے دل ودماغ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یک لخت دُنیا کی رنگینیوں سے دل اچاٹ ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کایا ہی بدل گئی۔ داڑھی چھوڑ دی۔ زہدو تقویٰ میں زیادہ مستعد ہوگئے۔ علم کی پیاس از سرِ نو عود کر آئی۔ دینی کتب کے مطالعے کا شوق بڑھ گیا۔ لڑکپن میں جو کتابیں اور رسائل سرسری پڑھے تھے انہیں دوبارہ غور وخوض سے پڑھا۔ مولوی نوازش علی جو دلی کے مشہور واعظ تھے۔ ان سے علمِ فقہ پر کتابیں پڑھیں۔ مولوی فیض الحسن سے مقاماتِ حریری اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے سبقاً سبقاً پڑھے۔ شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق سے حدیث کی تعلیم حاصل کی پھر انہی سے علومِ قرآن کی تحصیل کی اور سند لی۔ اس دوران صہبائی، آزردہ اور غالبؔ کے ہاں بھی باقاعدگی سے حاضر ہوتے رہے اور اپنے عہد کے ان نابغوں سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ غالبؔ کے خاندان سے ان کے ننھیال کے خاندانی روابط تھے۔ وہ غالبؔ کو اپنا چچا سمجھتے تھے۔ غالبؔ بھی انہیں بیٹوں کی جگہ سمجھتے تھے اور ہمیشہ اُن سے بڑی محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے۔

آثارُ الصّنادید

1846ء میں سرسیّد احمد خان کو شہر دہلی اور اس کے نواح میں موجود پرانی تاریخی عمارات کے مشاہدے اوران کے بارے میں تحقیق وتجسس کا شوق پیدا ہوا۔ الطاف حسین حالؔی کا خیال ہے کہ تنخواہ میں ان کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ بھائی کی وفات کے بعد خاندان کا سارا بوجھ ان پر آ پڑا تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ دہلی کی پرانی عمارات پر کتاب لکھ کر اپنی آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ یہ خیال محلِ نظر ہے۔ اس قسم کی تحقیقی اور علمی کتاب سے کسی قابلِ لحاظ آمدنی کی کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ آمدنی ہی بڑھانا تھی تو کسی کاروبار یا تجارت کی طرف متوجہ ہوتے۔ دراصل ان کی فطرت میں تحقیق وجستجو، مشکل پسندی اور مہم جوئی کا پیدائشی جذبہ تھا جو انہیں قدیم تاریخی عمارات کی طرف کشاں کشاں لے گیا۔ انہوں نے اس ذوق وشوق اور انہماک سے عمارات پر تحقیق کی کہ آج تک نہ ان سے پہلے کسی نے اس موضوع پر اتنی محنت کی نہ ان کے بعد ہی کسی نے کوئی ایسی دستاویز مرتب کی جو اس موضوع پر ان کی کتاب ''آثارالصنادید'' کا مقابلہ کر سکے۔ انہوں نے نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے دوسو کے قریب پرانی عمارات کا بغور جائزہ لیا۔ ان کے کتبے پڑھے۔ ان کا طول عرض اور اونچائی ناپی۔ کتبوں کی نقلیں تیار کروائیں اور یہ اہتمام کیا کہ ان میں وہی رسم الخط برقرار رکھا جائے جس میں اصل کتبے کی عبارت لکھی ہوئی ہے۔ ہر عمارت کے بنانے والے کے حالات، عمارت کی تعمیر کا مقصد، اس کی مختصر تاریخ، عمارات کے اسکیچ، ان کی شکست وریخت اور اس میں اضافوں کا حال، اس کے نقشے اور تعمیر کی فنی باریکیاں، معماروں کا حسنِ کارکردگی، غرض ہر ممکنہ تفصیل سرسیّد نے اپنی کتاب آثارالصنادید میں جمع کی۔ اس مقصد کے لئے تعطیلات کے دنوں کے علاوہ انہوں نے کئی کئی راتیں بھی اسی مشاہدے اور مطالعے میں جاگ کر گزاریں۔ اس کام میں ان کے دوست امام بخش صہبائی ان کے ہم رکاب ہوتے تھے۔ اس محنت طلب کام میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں اس کا کچھ اندازہ سرسیّد کے مندرجہ ذیل بیان سے

لگایا جاسکتا ہے:۔

''قطب صاحب کی لاٹ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاسکتے تھے ان کو پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا کرتے تھے۔ میں خود اُوپر چڑھ کر اس چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اُتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔''[16]

مولانا حالی نے اس اقتباس کے ضمن میں عربی کا جو ایک شعر نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہے ''وہ ایسے شوق سے اُوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اس کو آسمان پر کوئی کام ہے۔'' سرسید کی پوری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ شعر ان پر کتنا صادق آتا ہے۔

آثار الصنادید نہ صرف ڈیڑھ سال میں مکمل کر لی گئی بلکہ زیورِ طبع سے بھی آراستہ ہوگئی۔ اس کتاب کے چار باب ہیں۔ پہلا باب عماراتِ بیرونِ شہر کے بارے میں ہے، دوسرے باب میں لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کا بیان ہے، تیسرا باب خاص طور پر شاہ جہاں آباد کی عمارات پر ہے۔ چوتھے باب میں دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کا ذکر ہے۔ جو ماضی قریب میں ہو گزرے ہیں اور جو خود سرسید کے زمانے میں بقید حیات تھے۔ اس باب میں ایک سو بیس مشائخ، علماء، فقراء، مجذوبوں، اطباء، قراء، شعراء، خوشنویسوں، خطاطوں، مصوروں اور موسیقاروں کا تذکرہ ہے۔

آثار الصنادید سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید کو میرزا غالب سے کس قدر تعلقِ خاطر اور عقیدت تھی۔ ''ذکرِ بلبل نوایانِ سوادِ جنت آباد حضرت شاہ جہاں آباد'' کے عنوان کے تحت شعرائے دہلی کا جو تذکرہ آثار الصنادید میں ہے اس میں سرِ فہرست میرزا غالب ہی کا ذکر ہے۔ میرزا غالب کے بارے میں سرسید رقمطراز ہیں۔

''ان کی نعمت تربیت کا راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان نہ قدرتِ تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے...... میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔''[17]

سر سید کی اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں ذوقِ شعری اور سخن شناسی کا مادہ آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزاد سے کہیں بڑھ کر تھا۔

جن مشاہیر نے آثار الصنادید کی تقریظیں لکھیں ان میں میرزا غالب بھی تھے۔ سر سید سے اپنے تعلق کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"بامنش پیمان مہری ست،از دل نشینی به پیوند خون مانا۔"[18]

ترجمہ:

یعنی میرے ساتھ وہ پیمانِ محبت ہے کہ وہ میرے دل میں خونی رشتے کے مانند ہے۔

آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن جو 1847ء میں شائع ہوا اس سادہ اور دل نشیں طرزِ تحریر میں نہیں تھا جو سر سید کا اسلوبِ خاص ہے۔ پہلے ایڈیشن کی عبارت امام بخش صہبائی کے زیرِ اثر ادق اور پیچیدہ ہے۔ سر سید کو جلد ہی اس طرزِ تحریر کی کجی اور خامی کا احساس ہوگیا۔ دوسرے ایڈیشن کے لئے انہوں نے ساری کتاب کو از سرِ نو لکھا اور مطالب کو سادگی اور صفائی سے بیان کیا۔ اس دوران خطوطِ غالب کی سادہ اور رَواں دَواں نثر نے بھی ان کے ذوق کی تربیت کی اور وہ اپنی تحریروں میں خواہ مخواہ کے مشکل الفاظ اور دور از کار تشبیہات واستعارات سے گریز کرنے لگے۔ آثار الصنادید میں انہوں نے اُردو زبان کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے۔

دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رابرٹسن کو آثار الصنادید اتنی پسند آئی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لندن لے گیا۔ واپسی پر 1854ء میں سر سید کے ساتھ بیٹھ کر اس نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ مگر آثار الصنادید کا جو ترجمہ تمام یورپ میں پھیلا وہ موسیو گارسن دتاسی کا فرانسیسی ترجمہ ہے جو اس نے 1861ء میں کیا۔ اس کتاب کو یورپ کے علمی حلقوں میں بڑا سراہا گیا۔ اس تصنیف کی بنیاد پر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سر سید احمد خان کو اپنا فیلو بنالیا اور 4 جولائی 1864ء کو لندن سے سر سید کے نام باقاعدہ فیلوشپ کارڈ جاری کیا۔

تحریر و تصنیف کا مزید کام

اپنے قیامِ دہلی کے دوران سرسیّد نے مختلف موضوعات پر چھ رسالے بھی لکھے۔ جن کے نام یہ ہیں:۔

1) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار 1846ء۔ سرسیّد کے نانا نواب دبیر الدولہ نے ایک کتابچہ پُرکار متناسبہ کے اعمال پر فارسی میں لکھا تھا۔ یہ اس کا اُردو ترجمہ ہے جس میں سرسیّد نے اپنی طرف سے مثالوں اور وضاحتوں کا اضافہ کیا۔

2) قولِ متین در ابطال حرکت زمین۔ اس میں اس موضوع پر دلائل جمع کیے تھے کہ زمین حرکت نہیں کرتی۔ مگر سرسیّد نے بعد میں جلد ہی اپنے اِس خیال سے رجوع کر لیا تھا اور حرکتِ زمین کے قائل ہو گئے تھے۔

3) پیری مریدی اور بیعت کے مروجہ طریقہ کے خلاف ایک رسالہ کلمۃ الحق لکھا۔

4) 1850ء میں ایک رسالہ راہِ سنت در ردِ بدعت کے نام سے قلم بند کیا۔

5) سلسلہ نقشبندیہ میں جو تصورِ شیخ ہے اور جسے وہ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اس کے حق اور اس کی وضاحت میں ایک رسالہ 1853ء میں لکھا۔

6) سلسلۃ الملوک کے نام سے 1852ء میں ایک صحیح اور جامع فہرست ان راجاؤں، فرماں رواؤں اور سلاطین اور بادشاہوں کی مرتب کی جو پچھلے پانچ ہزار برس سے دہلی میں حکمران رہے۔ اس میں راجہ یدھشٹر سے لے کر ملکۂ معظمہ قیصرۂ ہند تک 202 فرماں رواں ہیں۔ ان کے بارے میں مختصر کوائف بھی اس فہرست میں درج ہیں یہ تاریخی معلومات نہایت محنت اور جاں فشانی سے اکٹھی کی ہیں۔

7) کیمیائے سعادت کے کچھ ابتدائی ابواب کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا۔

سرسیّد کی ان علمی و اَدبی سرگرمیوں سے اس زمانے میں ان کی مختلف دلچسپیوں کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان میں جو بے پناہ قوتِ کار تھی اس کا پتہ چلتا ہے۔

سرسیّد کی ترقی بطور مُنصف درجہ اوّل ہوگئی تھی اور انگریز انتظامیہ اس سے بھی اُوپر انہیں صدرِ امین کے عہدے پر مقرر کرنا چاہتی تھی مگر وہ دہلی سے باہر جانے پر راضی نہ تھے۔ مختصر عرصہ کے لیئے انہیں قائم مقام صدرِ امین کے طور پر رہتک بھیجا گیا۔ مگر وہ پھر دہلی واپس آ گئے۔ آخر جنوری 1855ء میں جب ضلع بجنور میں صدرِ امین کی مستقل آسامی خالی ہوئی تو انہیں اس پر تعینات کیا گیا۔ وہاں جا کر انہوں نے ضلع بجنور کی مفصل تاریخ لکھنی شروع کر دی اور ابوالفضل کی مشہور کتاب آئینِ اکبری کی تصحیح یعنی ایڈیٹنگ کا کام کیا جو بڑا محنت طلب تھا۔

مسٹر شیکسپیئر کلکٹر ضلع بجنور نے سرسیّد کی تصنیف کردہ تاریخِ بجنور کے بارے میں اپنی ایک چٹھی میں لکھا:۔

> ''سیّد احمد خان ان باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں جو ان کے خاص کام سے علاقہ نہیں رکھتیں۔ چنانچہ انہوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی۔ غدر سے چند روز پہلے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں میرے پاس موجود ہوتی تو بہت کارآمد ہوتی مگر غالب ہے کہ آگرہ میں باعثِ غدر تلف ہوگئی ہوگی۔''[19]

آئین اکبری

1855ء میں سر سیّد نے ابو الفضل کی مشہور کتاب آئینِ اکبری پر اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ آئینِ اکبری کی تدوین و ترتیب اور تصحیح میں جو محنت اور جاں فشانی سر سیّد نے بہم پہنچائی، حیرت انگیز ہے۔ ایک تو ابو الفضل کا اسلوب بیان بڑا ادق اور پیچیدہ تھا۔ پھر اس میں ہر طرح کے فارسی، عربی، ہندی، ترکی اور سنسکرت کے اکثر نامانوس الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ مختلف نسخوں میں کاتبوں کی غلطیوں کی وجہ سے عبارت اور متعدد الفاظ میں فرق آ گیا تھا۔ سر سید نے مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ مشکل اور نامانوس الفاظ کی تشریح کی۔ اکبر کے عہد کے سکوں، ٹکسال، آلات، ظروف، اوزار، ہتھیار اور زیورات، شکار اور یورش کے موقع پر شاہی خیمہ گاہ، چراغ خانہ اور اکبر کی آتش پرستی، شکوہ سلطنت کے تمام لوازمات، تزک و احتشام کے مناظر، فیل خانہ، ہاتھیوں کی پوشش، ہاتھیوں کی کشتی، اس زمانے کے تمام پھل دار اور پھول دار درخت، ان کی شاخیں، برگ و ثمر اور پھول پتے، غرض ہر شے کی تصاویر دلی کے لائق مصوروں سے بنوا کر کتاب میں شامل کیں۔ واقعات کے سن و سال، خراج کی رقوم اور محاصل، ہر طرح کی جدولیں جو آئینِ اکبری میں تھیں ان کی جا بجا تصحیح کی۔ مثلاً اکبر کے عہد کے شاہی محاصل کی رقوم آئینِ اکبری کے مختلف نسخوں میں مختلف درج تھیں۔ سر سیّد نے بڑی تحقیق و جستجو سے محاصل کی صحیح رقوم کا تعین کیا۔ سر سیّد کے نانا نواب دبیر الدولہ کے ذاتی کتب خانے کے ریکارڈ میں ایک سرکاری دستاویز ایسی مل گئی، جو نواب صاحب نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں مغل بادشاہوں کے عہد بہ عہد محاصل کے موضوع پر تیار کروائی تھی۔ اس کی مدد سے آئینِ اکبری کے نسخوں میں راہ پا جانے والی غلطیوں کو درست کیا۔

آثار الصنادید کی طرح آئینِ اکبری کی تصحیح و تدوین بھی ایک ایسا دشوار اور محنت طلب کام تھا جو سر سید احمد خان کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ یورپ کے عالموں نے سر سیّد کے اس کام کی بڑی قدر

کی۔ کلکتہ کالج کے پرنسپل مسٹر بلاک مین نے 1873ء میں آئینِ اکبری کا جو مشہور انگریزی ترجمہ کیا، اس کے لیے سرسیّد کے مرتب کردہ نسخے کو ہی بنیاد بنایا۔ اسی زمانے میں فرانسیسی اور انگریزی میں اس کے متعدد ترجمے شائع ہوئے۔ ان سب میں وہی تصاویر دی گئیں، جو سرسید نے اپنے مدون شدہ نسخے کے لیئے تیار کروائی تھیں۔ ان تصاویر کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ سرسیّد کے اس علمی کارنامے کے بارے میں کلکتہ کالج کا پرنسپل رقمطراز ہے:۔

> ''یہ کتاب مسلمانوں کی تاریخوں میں جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ یہ فی الواقع اس سلطنت کی جو 1590ء کے لگ بھگ قائم تھی، ایک ایڈمنسٹریشن رپورٹ ہے۔ اکبر کے عہد کے وہ تمام حالات وواقعات درج ہیں جن کے لیئے ہم اس زمانے میں ایڈمنسٹریشن رپورٹوں، نقشوں اور گزیٹیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔''[20]

آئینِ اکبری کے بارے میں حاؔلی کی رائے ہے کہ ایسی نادرالوجود کتاب کی تصحیح وتہذیب مُلک پر ایک بہت بڑا احسان تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کے ایک نامور مصنف اور نامور بادشاہ کے کارناموں کو دُنیا کے سامنے دِل نشیں صورت میں پیش کیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میرزا غاؔلب اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے سرسیّد کے اس کام کو تضیعِ اوقات جانا۔ وہ سمجھتے تھے کہ آئینِ اکبری ایسی کتاب نہیں ہے جس پر سرسیّد جیسا شخص اپنی ذہنی صلاحیتیں اور بے مثال قوتِ کار صرف کرتا۔ جس طرح آثارُ الصنادید پر سرسیّد نے میرزا غاؔلب سے تقریظ لکھوائی تھی، اسی طرح آئینِ اکبری پر بھی ان سے تقریظ لکھنے کی درخواست کی۔ غاؔلب نے بجائے نثر کے فارسی نظم میں ایک مثنوی کے پیرائے میں تقریظ لکھی۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کے الفاظ میں اس تقریظ کا لب لباب یہ ہے کہ:

> ''اس دفترِ پارینہ کو زندہ کرنے کے لیئے سرسیّد جیسے باصلاحیت آدمی کا اس قدر محنت صرف کرنا وقت کا زیاں ہے۔ یہ وقت آئینِ اکبری پر نگاہ بازگشت ڈالنے کا نہیں بلکہ انگریزوں کے آئین و دستور سے نظر ملانے کا ہے۔ جنہوں نے عناصرِ فطرت کو تسخیر کر کے نو بہ نو ایجادات کی ہیں اور بحر و بر پر

اپنا سکہ رواں کر دیا ہے۔"[21]

ڈاکٹر خورشید رضوی رقمطراز ہیں

"بدلے ہوئے احوال پر میرزا غالبؔ کی عمیق سے عمیق تر نظر کے ساتھ ساتھ ان کی خداداد مردم شناسی بھی روز افزوں تھی۔ انہوں نے سر سیّد کی ان غیر معمولی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا۔ جو ابھی خود سر سیّد پر آشکار نہ تھیں۔ وہ سر سیّد کو بہت بلند تر کارناموں کا اہل سمجھتے تھے۔ لہٰذا اس کام پر تھپکی دے کر ان کے امکانات کو خوابیدہ کر دینا مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔ غالبؔ کی بر محل صاف گوئی اور نکتہ چینی سے، ایک بڑی شخصیت کا رُخ ماضی سے پھر کر حال و مستقبل کی طرف ہو گیا۔ اس تقریظ نے نہ صرف سر سیّد پر بلکہ بالواسطہ مسلمانانِ برِ صغیر پر ایک احسان کیا۔"[22]

سر سید نے اس تقریظ کو کتاب میں شامل نہ کیا۔ انہیں تو وقتی طور پر اس سے صدمہ پہنچا۔ انہوں نے تقریظ یہ کہہ کر میرزا غالبؔ کو واپس لوٹا دی کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں، مگر میرزا کو اپنی رائے کی اصابت کا احساس تھا۔ غالباً اسی لیئے انہوں نے نثر کے بجائے تقریظ نظم میں لکھی اور اُسے اپنے کلیاتِ فارسی میں شامل کیا تاکہ محفوظ رہے۔ غالبؔ نے سر سیّد کو لکھا:

"ابھی تک آپ پرانے آئینِ جہاں بانی کی ترتیب و تصحیح میں لگے ہیں۔ حالانکہ زندگی کا نیا آئین کلکتہ تک پہنچ گیا ہے اور بہت جلد ہند کی ساری تہذیبی زندگی کو اپنی گرفت میں لے لے گا۔"[23]

1857ء

سر سیّد کو بجنور میں بطور صدر امین دو سال چار ماہ گزر چکے تھے کہ 10 مئی 1857ء کو یکا یک وہ خُوں ریز لڑائی شروع ہو گئی جسے انگریزوں نے بغاوت اور غدر کا نام دیا اور مسلمان مؤرخین جسے 1857ء کی جنگِ آزادی کہتے ہیں۔ بہر حال تاریخ، حکومت کے خلاف ہر اس مسلح جدو جہد کو جو نا کام ہو جائے بغاوت کا نام ہی دیتی ہے۔ مقامی لوگ بے قابو ہو کر ان انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتارنے لگے جو انگریزی فوج کا حصہ نہ تھے اور جنگ وجدل سے جن کا کوئی سروکار نہ تھا۔ انگریزوں کے تقریباً بیس گھرانے بجنور میں تھے۔ سر سیّد نے ہر قیمت پر ان یورپین خاندانوں کی جان بچانے کی ٹھان لی۔ مسٹر شیکسپیئر بجنور کے کلکٹر تھے۔ سر سیّد نے ان کی بیگم کو متفکر اور خوف زدہ پایا تو کہا:

''جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ جب آپ دیکھیں کہ میری لاش کوٹھی کے باہر پڑی ہے، اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔''[24]

اس ابتلا میں سر سیّد نے کئی راتیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاگ کر اور مسلح پہرہ دیتے ہوئے گزار دیں۔ ایک دفعہ تو حملے کا خطرہ اِتنا حقیقی تھا کہ سر سیّد گھر میں اپنے اہل وعیال سے الوداع ہو کر اور خدا حافظ کہہ کر نکلے کہ معلوم نہیں زندہ لوٹنا ہو گا یا نہیں۔

حیاتِ جاوید کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اُس وقت کی نازک صورتِ حال اور سر سیّد کی جرأت اور ان کے استقلال کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''وہ رات، جب کہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین مرد، عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعتِ کثیر جو بظاہر اُن کی حفاظت کے لیئے فراہم ہوئی تھی، ان کی نیتیں بگڑ گئی تھیں اور کچھ فوج اور توپ خانہ باغیوں کا ان کی کُمک کے لیئے مراد آباد سے

عنقریب آنے والا تھا، نہایت سخت تھی۔ اس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ ایسے نازک وقت میں سر سیّد تنہا اس خود سر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خان سے جو اُن کا سر غنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا...... بہتر ہے کہ ان کو صحیح و سالم یہاں سے جانے دو اور تم مُلک کے مالک بن جاؤ۔ ایسے ٹیڑھے وقت سر سیّد کے ہوش وحواس بالکل بجا اور درست رہے۔''[25]

سر سیّد ان دنوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''مجھ سے اگر کچھ اچھی خدمت یا وفاداری گورنمنٹ کی ہوئی تو وہ بالکل میں نے اپنے مذہب کی پیروی کی...... میں نے جو کچھ کیا اپنے خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کی۔''[26]

بدامنی اور قتل و غارت کے اس زمانے کا مفصل حال سر سیّد نے اپنی کتاب سر کشیٔ ضلع بجنور میں قلمبند کیا ہے۔ اس دوران حالات نے کئی پلٹے کھائے۔ نواب محمود خان جس کا ذِکر اُوپر آیا ہے، بجنور پر قابض ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے انگریزوں کے خاندان بجنور سے بحفاظت رُوڑکی منتقل ہو چکے تھے۔ نواب محمود خان نے بجنور پر قبضہ کر کے سر سیّد کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ جس پر اس نے سر سیّد کو ان کی سرکاری رہائش گاہ سے نکال دیا۔ یہ عرصہ سر سیّد نے بڑی تنگی اور مصیبت میں گزارا۔ اس کے بعد علاقہ کے ایک بااثر اور زور آور گروہ نے نواب محمود خان کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ سر سیّد کسی طرح جان بچا کر میرٹھ چلے گئے۔ جس وقت وہ میرٹھ پہنچے تو ان کے پاس چھ پیسے اور پھٹے ہوئے کُرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا۔ پانچ ماہ تک وہ میرٹھ میں اُٹکے رہے۔ اتنے میں دہلی سے یہ خبریں آئیں کہ انگریزی فوج شہر پر قابض ہو گئی ہے اور مسلمانوں کو بے دریغ مارا جا رہا ہے۔ سر سیّد کے ماموں وحید الدین خان اور ان کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خان کو سپاہیوں نے قتل کر دیا۔ سر سید کے انتہائی مخلص اور شفیق دوست امام بخش صہبائی گولی کا نشانہ بن گئے۔ خود سر سیّد کا گھر لوٹ لیا گیا۔ ان کی بوڑھی والدہ نے گھر سے بھاگ کر ایک پرانی جاننے والی بے آسرا عورت زے بن کی کوٹھڑی میں پناہ لی۔ یہ زے بن وہی ہے، جس کی دیکھ بھال سر سیّد کی والدہ اکثر کیا کرتی تھیں۔ سر سیّد کس حال میں وہاں پہنچے اور اپنی والدہ سے ملے، اس کا حال انہوں نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''جب میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو انہوں نے کواڑ کھولے اور سب سے پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ ''ہیں، تم یہاں کیوں چلے آئے؟ یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو گزرے گی، گزر جائے گی۔'' میں نے کہا'' آپ خاطر جمع رکھیے۔ میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے اور دلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ تب ان کی خاطر جمع ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ دو دِن سے پانی نہیں پیا تو پانی کی تلاش میں نکلا۔ کنوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے پانی نکالا جا سکے۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ میں سیدھا پھر قلعے میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہی زے بن بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ تھوڑی دُور چل کر بیٹھ گئی پھر اُٹھا نہ گیا میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا کہ پانی پی لے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی اپنی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی (یعنی والدہ سر سیّد احمد خان) پیاسی ہیں۔ ان کے لئے پانی لے جاؤں گی اور اسی لیے صراحی میں پانی ڈالا تھا۔ میں نے کہا میرے پاس پانی بہت ہے۔ تُو پانی پی لے۔ پھر آبخورہ میں پانی دیا۔ وہ پانی پی کر لیٹ گئی۔ میں دوڑا ہوا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا سا پانی پینے کو دیا۔ اُنہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرٹھ لے جاؤں۔ باہر آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ زے بن مری پڑی ہے۔ پھر سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے، کہیں سواری نہ ملی۔ آخر قلعہ کے حکام نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے، وہ ان کو مل جائے۔ میں وہ شکرم لے کر گھر آیا اور والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔''[27]

میرٹھ میں سرسید کی والدہ بیمار پڑ گئیں اور چند روز بیمار رہ کر انتقال کر گئیں۔ 1858ء کے آغاز میں شیکسپیئر کلکٹر بجنور مع اپنے عملہ کے بجنور واپس پہنچا اور ضلع کا انتظام و انصرام از سرِ نو سنبھالا۔ سرسیّد بھی اس کے ہمراہ بجنور پہنچے اور اپنے دفتر اور گھر کا قبضہ حاصل کیا۔ باغیوں کی پکڑ دھکڑ اور سرکوبی شروع ہوئی تو کئی لوگ جنہوں نے سرکشی کے دنوں میں سرسیّد کو ذاتی طور پر پریشان کیا تھا بلکہ ان کی جان کے درپے ہو گئے تھے اب خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے ان کی جان اب سرسیّد کی مٹھی میں تھی۔ سرسیّد نے ان کی معافی کی سفارشیں کیں اور بہت ساروں کی گلو خلاصی کرائی۔ حاؔلی لکھتے ہیں کہ سرسیّد ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ضلع کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ کیا گیا۔

سرسیّد نے جو خیر خواہی بدامنی کے دنوں میں گورنمنٹ کی کی اور جس وفاداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت بہم پہنچایا اور جس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر انگریز خاندانوں کی جان بچائی اس کے صلے میں حکومت نے ضلع بجنور میں ایک مسلمان باغی کی ضبط شدہ جاگیر بطورِ انعام انہیں دینا چاہی مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ حاؔلی لکھتے ہیں کہ:

> ''جو شخص سرسیّد کی طبیعت اور جبلّت سے واقف ہوگا وہ اس بات کو بآسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری ان سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اس نازک وقت میں ان سے کوئی اَمر اخلاق، شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔''[28]

28 دسمبر 1889ء کو ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر کے دوران 1857ء کے سانحے کا ذکر کرتے ہوئے سرسیّد نے کہا۔

> ''غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا تھا اور غدر کے دوران ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا، اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ

پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دُنیا میں نہ ہوگا کہ
قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔"[29]

اپریل 1858ء میں سرسیّد صدر الصدور کے عہدے پر ترقی پا کر مراد آباد میں تعینات ہوئے۔ اسکے علاوہ انہیں اس اسپیشل کمیشن کا ممبر بھی نامزد کیا گیا جو ضبط شدہ جائیدادوں کی عذرداریوں کا فیصلہ کرنے کے لیئے قائم کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کے دوسرے دو ممبر انگریز تھے ایک روہیل کھنڈ کے کمشنر اور دوسرے مراد آباد کے جج تھے۔ مراد آباد میں متعدد ضبط شدہ جائیدادیں واگزار ہوئیں۔ مراد آباد کے ایک مسلمان رئیس مولانا عالم علی جو مشہور عالم، طبیب اور محدث تھے انہوں نے غدر کے دِنوں میں چند یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی مگر باغیوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے زبردستی مولانا عالم علی کے گھر میں گھس کر ان عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس میں مولانا عالم بے قصور اور بے بس تھے مگر انگریز حکام کو ان پر سازش کا شبہ تھا۔ جب انگریزوں کی عملداری دوبارہ قائم ہوئی تو وہ مواخذے اور سزا کے ڈر سے رُوپوش ہو گئے۔ سرسیّد نے ان کے بارے میں انگریز حکام کے شکوک رفع کیے اور ان کی بے گناہی ثابت کر کے انہیں مواخذے سے بچایا۔ ضابطے کی کارروائی کے بعد انہیں بری کر دیا گیا۔ اسی طرح جہاں جہاں سرسیّد کا بس چلا مسلمانوں کی مدد کی اور ان کی مصیبتوں کو کم کیا۔

مراد آباد میں ہی اپنے قیام کے دوران سرسیّد نے تاریخ سرکشی بجنور تحریر کی اور مئی 1857ء سے اپریل 1858ء تک ضلع بجنور میں جو واقعات پیش آئے ان کو تاریخ وار ترتیب اور پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا، وہ تمام خط و کتابت بھی اس میں شامل کی جو اس دوران اِن کے اور رُڑکی میں مقیم انگریز حکام کے درمیان ہوئی یا نواب محمود خان اور ہندو چوہدریوں نے ان کے ساتھ کی۔ حالی لکھتے ہیں کہ یوں لگتا ہے وہ اس کتاب کے لیئے تمام ضروری دستاویزات سنبھال کر حفاظت سے رکھتے گئے۔ حالانکہ اس زمانے میں باغیوں نے انہیں ان کی رہائش گاہ سے نکال باہر کیا تھا اور ان کا سارا مال و اسباب تلف کر دیا تھا۔ مگر سرسیّد کسی نہ کسی طرح وہ تمام خط و کتابت اور ضروری دستاویزات جو اس دوران ان کے ہاتھ سے گزریں بحفاظت رکھتے گئے اس سے دو باتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان دِنوں جب ان کی جان کو خطرہ تھا وہ خوف و ہراس کا شکار نہیں ہوئے۔ دوسرے یہ کہ انہیں برابر اس اَمر کا یقین رہا کہ انگریزی عملداری دوبارہ قائم ہو جائے گی۔ واقعات کے بیان میں سرسیّد نے کسی تعصب کو اپنے اُوپر بالکل طاری نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ ضلع کے ہندو چوہدریوں نے اس زمانے میں مسلمانوں پر بڑا

ظلم وتشدد کیا تھا مگر چونکہ وہ انگریز حاکموں کے خلاف بغاوت پر آمادہ نہیں ہوئے تھے، اس لیے سرسیّد نے ان کا شمار حکومت کے باغیوں میں نہیں کیا۔

مقامی باشندوں خاص کر مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دُور کرنے کا خیال سرسیّد کو شروع سے ہی تھا۔ انہوں نے 1859ء میں مرادآباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ ان ہی دِنوں ایک یادداشت اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی جس میں اس اُمر کی تلقین کی کہ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ تمام تعلیم انگریزی زبان میں دے۔ ان کا خیال تھا کہ اُردو زبان ابھی اس قابل نہیں ہے کہ جملہ علوم کی متحمل ہوسکے۔ اس سے طلباء میں وہ لیاقت اور اہلیت پیدا نہیں ہوسکتی جو انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے ہوگی پھر یہ کہ محکمۂ تعلیم کو نئے سائنسی علوم بھی نصاب میں شامل کرنے چاہئیں۔ تعلیم کا مقصد صرف حصولِ معاش نہیں ہونا چاہیئے اس کا مقصد یہ ہو کہ ذہنوں کو بالیدگی عطا کرے اور طبیعتوں کو ایجادواختراع کی طرف مائل کرے۔ سرسیّد نے یہ یادداشت محکمۂ تعلیم کے علاوہ گورنمنٹ کے دوسرے تمام دفتروں اور مختلف انجمنوں اور اداروں کو بھیجی تاکہ اس سلسلے میں ایک عام رائے قائم ہوسکے۔

مسلمانوں کے دفاع میں سرسیّد کا جہاد

1857ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزی عملداری دوبارہ قائم ہوئی تو انگریزوں نے مسلمانوں کو خصوصی طور پر اپنے انتقام اور غیض وغضب کا نشانہ بنایا۔ ان پر بغاوت کا جُرم ثابت کرنے کے لیئے یہی دلیل کافی تھی کہ وہ مسلمان ہیں۔ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے ہتھیائی تھی وہ بجا طور پر انہیں ہی اپنا حریف اور دشمن سمجھتے تھے اور 1857ء میں جو کچھ ہوا مسلمانوں کو ہی اس کا ذمہ دار گردانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ سب انہی کی سازش ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ ہندو بھی گورنمنٹ کی خیر خواہی کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے لے رہے تھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے۔ اس سب صورتِ حال کا نتیجہ مسلمانوں کی ہمہ گیر تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آرہا تھا۔ سرسیّد کسی نہ کسی طرح اس صورتِ حال کا تدارک کرنا چاہتے تھے۔ ویسے بھی 1857ء کے ہنگامے کے بارے میں ان کا موقف یہ تھا کہ یہ نہ تو ملکی بغاوت تھی نہ کوئی سوچی سمجھی ہوئی سازش بلکہ محض سپاہیوں کی حکم عدولی تھی جس نے پھیل کر مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرسیّد اس خیال میں اکیلے نہ تھے بلکہ انڈیا آفس کے اُس وقت کے انڈر سیکرٹری سرولیم کا بھی یہی خیال تھا۔ لارڈ لارنس نے بھی آخر میں انکوائری اور تحقیق کے بعد یہی فیصلہ دیا کہ یہ کارتوسوں کے سبب سے سپاہیوں کا ایک ہنگامہ تھا مگر عام تاثر یہی تھا کہ یہ سب مسلمانوں کا کیا دھرا ہے۔ سرسیّد مسلمانوں کے مفاد میں اور ان کو مکمل تباہی اور بربادی سے بچانے کے لیئے کسی نہ کسی طرح اس تاثر کو زائل کرنے کی فکر میں تھے۔ اس مقصد کے لیئے انہوں نے رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند تحریر کیا۔ یہ ان اوّلیں کاموں میں سے تھا جن کا آغاز انہوں نے اپریل 1858ء میں مراد آباد پہنچتے ہی کر دیا تھا۔ رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند میں سرسیّد نے دلائل اور شواہد سے یہ واضح کیا کہ نہ ہندوستانیوں نے عموماً اور نہ مسلمانوں نے خصوصاً انگریزوں کے خلاف قومی یا ملکی سطح پر کوئی بغاوت کی۔ وہ اس سلسلہ میں ہر طرح کی سازش یا بغاوت کے الزام سے بالکل بری ہیں یہ آگ جو سُؤر اور گائے کی چربی سے تیار ہونے والے کارتوسوں کے اِستعمال سے بھڑک اُٹھی اور ہندوستانیوں کے جذبات مشتعل

ہو گئے تو اس میں ساری غلطی انگریزی گورنمنٹ کی تھی۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے جذبات واحساسات کو اپنے رویے اور ناروا سلوک سے بُری طرح مجروح کیا ہوا تھا۔ سپاہی اور دوسرے لوگ انگریزوں کے خلاف جذبات سے بھرے بیٹھے تھے۔ کارتوسوں کے قصے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور یہ ہنگامہ یکا یک بغیر کسی سازش اور منصوبے کے برپا ہو گیا۔ سر سیّد نے اس نازک اور خطرناک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے اور جن کا واشگاف اظہار کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا، نہایت دلیری اور جرأت کے ساتھ بیان کر دیئے اور رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند کی پانچ سو کاپیاں 1859ء میں چھپوا کر تیار کروالیں وہ اس رسالے کو لندن میں ارکانِ پارلیمنٹ اور ہندوستان میں انگریز حکومت یعنی گورنر جنرل کو بھیجنا چاہتے تھے تا کہ وہ صحیح صورتِ حال سے مطلع ہوں۔ ان کے دوستوں اور خیر خواہوں نے ان کو اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ رائے شنکر داس نے جو اُس وقت مراد آباد میں مُنصف تھے اور سر سیّد کے قریبی دوست تھے، سر سیّد سے کہا ان سب کتابوں کو جلا دو اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالو۔ سر سیّد کا جواب تھا:

> ”میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔“[30]

سر سیّد نے کمرِ ہمت باندھ لی اور اللہ کا نام لے کر رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند کی پانچ سو سے کچھ کم کاپیاں ارکانِ پارلیمنٹ، برطانوی حکومت اور انڈیا آفس میں تقسیم کرنے کی غرض سے بذریعہ ڈاک لندن روانہ کر دیں اور ایک کاپی گورنمنٹ آف انڈیا کو خاص کر گورنر جنرل کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دی۔ اُس وقت گورنر جنرل لارڈ کیننگ (Canning) تھا اس نے سر سیّد کے رسالے کا انگریزی میں ترجمہ کروایا، اس کے مندرجات کا جائزہ لیا اور اپنی کونسل کے ممبران کے اجلاس میں اس پر بحث کی۔ خود لارڈ کیننگ کی یہ رائے تھی کہ سر سیّد نے یہ مضمون حکومت کی خیر خواہی کے جذبے سے اور اس کو صحیح صورتِ حال سے مطلع کرنے کی غرض سے لکھا ہے تا کہ اصلاح احوال ہو مگر کونسل کا ایک ممبر سر سیسل بیڈن جو اُس وقت سیکرٹری خارجہ تھا سر سیّد کے رسالہ کے مندرجات پر سخت برافروختہ ہوا اور اس تحریر کو بغاوت پر محمول کیا اور مطالبہ کیا کہ مصنف پر مقدمہ چلایا جائے اور ضابطے کی کاروائی عمل میں لائی جائے مگر گورنر جنرل اور دوسرے ممبروں نے مسٹر بیڈن کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ بعد میں سر سیّد سے اپنی ملاقات میں بیڈن نے ان سے بڑی تلخ بحث کی اور کہا کہ اگر تمہارا مقصد محض حقیقتِ حال بیان کرنا اور

اصلاح کی صورت پیدا کرنا تھا تو تمہیں چاہیئے تھا کہ اس رسالے کی اشاعت کا اہتمام نہ کرتے بلکہ صرف ایک کاپی لکھ کر گورنر جنرل کو پیش کر دیتے جب سرسیّد نے اُسے بتایا کہ پورے ہندوستان میں یہ رسالہ صرف گورنر جنرل کو ہی بھیجا گیا ہے صرف ایک دو کاپیاں ان کی ذاتی تحویل میں پڑی ہیں اور باقی تقریباً پانچ سو کاپیاں لندن بھیج دی گئی ہیں، تو بیڈن کو اس بات کا یقین نہ آیا مگر جب تحقیق سے پتہ چلا کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہے تو اس کے دل سے سرسیّد کے بارے میں جو بدگمانی پیدا ہوگئی تھی دُور ہوگئی اور وہ ان کا دوست بن گیا۔

لندن میں رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند کے متعدد ترجمے ہوئے اور وہاں اہلِ سیاست اور اہلِ حکومت کے حلقوں میں اس پر بڑی بحث وتمحیص ہوئی۔ دوسروں کو اپنی تحریر اور تقریر سے قائل کرنے کی ایسی قابلیت اللہ تعالیٰ نے سرسیّد کو دی تھی کہ بیشتر ارکانِ پارلیمنٹ اور عمائدینِ حکومت سرسیّد کے نقطۂ نظر کے قائل ہوگئے۔ بعد میں جو ہندوستان کا انتظام وانصرام ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے لیکر براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تحت کر دیا گیا تو اس میں کافی حد تک سرسیّد کے خیالات کے اثر ونفوذ کا عمل دخل بھی تھا۔ رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند میں انگریزی حکومت کی خامیاں بیان کرتے ہوئے سرسیّد نے اس اَمر کی نشاندہی بھی کی تھی کہ گورنر جنرل کی کونسل میں کوئی مقامی رکن موجود نہیں ہے۔ اس لیے اعلیٰ ترین انتظامی سطح پر ہندوستانیوں کی نمائندگی اور ان کے نقطۂ نظر کے اظہار کی کوئی صورت نہیں ہے۔ انہوں نے کونسل کے ارکان میں مقامی باشندوں کی شمولیت کی ضرورت پر زور دیا۔ سرسیّد کی یہ تجویز مان لی گئی اور لارڈ لٹن کے عہد میں سرسیّد کو گورنر جنرل کی کونسل کا رُکن نامزد کیا گیا۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند سے ہی مسٹر ہیوم کے ذہن میں انڈین نیشنل کانگرس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

1858ء اور 1859ء میں اخبارات میں 1857ء کے ہنگامہ کے بارے میں لوگوں نے، خاص کر انگریزوں اور ہندوؤں، نے متعدد مضمون لکھے، کئی انگریز مصنفین نے اس پر کتابیں شائع کیں۔ ان سب سے یہ تاثر اُبھرتا تھا کہ ساری خرابی کی جڑ مسلمان ہیں۔ اکثر اہلِ قلم کا مؤقف یہ تھا کہ مسلمان مذہباً عیسائیوں کے دُشمن ہیں۔ اُن کا مذہب اُنہیں عیسائیوں کے خلاف جہاد کرنے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ عیسائیوں کے خلاف جہاد ان پر مذہباً فرض ہے وہ انگریزی حکومت کے خیر خواہ اور اس کے وفادار ہو ہی نہیں سکتے۔ اس طرح کے تاثر کو پھیلانے والی جب کوئی تحریر سامنے آتی تو سرسیّد مضطرب ہو جاتے۔ اُنہیں محسوس ہوتا جیسے اندر ہی اندر مسلمانوں کے خلاف کوئی گہری سازش ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اتنا بے سروپا اور اس قدر سخت زہریلا پروپیگنڈہ کیا جارہا تھا کہ ہندوستان میں ان کا بطور مسلمان

زندہ رہنا مشکل نظر آرہا تھا۔ اکثر انگریز افسر جو پہلے ہی مسلمانوں کے خلاف غیض وغضب سے بھرے بیٹھے تھے، اس طرح کے مضامین پڑھ کر اور غضب ناک ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی روز بروز بھیانک سے بھیانک تر ہوتی جا رہی تھی۔ سرسیّد مسلمانوں کے مفاد میں اس تاثر کو زائل کرنے پر کمربستہ ہو گئے اس مقصد کے لیئے انہوں نے رسائل کا ایک سلسلہ شروع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جس کا نام ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' (Loyal Muhammadans of India) رکھا۔ پہلے تو اُنہوں نے دلائل سے یہ ثابت کیا کہ مذہب کی رُو سے ہندوستان کی تمام اقوام میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جو انگریزوں کی خیر خواہ اور وفادار ہو سکتی ہے۔ قرآن اور احادیث کے حوالے دے کر انہوں نے یہ واضح کیا کہ مسلمان جس طرح اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح وہ حضرت عیسیٰ اور بائبل پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ لکھا کہ مسلمانوں کے نزدیک اہل کتاب کی عزت وحرمت ایسی ہی ہے جیسے خود مسلمانوں کی عزت وحرمت ہے۔ اسلام کسی ایسے گروہ یا جماعت کے خلاف جہاد کی اجازت نہیں دیتا جو ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مخل نہ ہو رہی ہو۔ پھر سرسیّد نے ہندوستان کے طول وعرض سے ایسے مسلمانوں کے کوائف اکٹھے کیے جنہوں نے خود انہی کی طرح فسادات اور خونریزی کے دنوں میں انگریزوں سے خیر خواہی اور ہمدردی کا برتاؤ کیا تھا بلکہ بعض مسلمانوں نے انگریزوں کی حفاظت میں اپنی اور اپنے گھر والوں کی جانوں کی قربانی دی تھی۔ گورنمنٹ نے بعد میں اپنی عملداری کی بحالی کے بعد ان کی خدمات کے صلے میں ان کو انعام واکرام سے بھی نوازا تھا۔ ایسی ایک دو نہیں بیسیوں مثالیں تھیں، جن کا ذکر سرسیّد نے گورنمنٹ کی رپورٹوں اور انعام واکرام کی دستاویزوں کے حوالے دے کر کیا۔ ان موضوعات پر تین رسالے شائع ہوئے۔ ان کی وسیع نشر واشاعت کی گئی اور ان کو انگریز حاکموں میں تقسیم کیا گیا تا کہ ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف جو نفرت آمیز تعصب آ گیا تھا وہ دُور ہو اور وہ جس طرح ہر خرابی اور برائی کی جڑ مسلمانوں کو سمجھنے لگے تھے اس رجحان کا قلع قمع ہو مسلمانوں کے حق میں بلا شبہ سرسیّد احمد خان کی یہ ایک بڑی خدمت تھی۔ انگریزوں کا عام عقیدہ اس وقت یہ تھا کہ اسلام اور تہذیب وشائستگی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سرسیّد نے دلیلیں اور مستند حوالے دے کر یہ ثابت کیا کہ اسلام اور صرف اسلام ہی سب سے بڑھ کر تہذیب وشائستگی، خوش اخلاقی اور دوسروں سے ہمدردی کا سبق دیتا ہے۔ چند مسلمانوں کی غلط روش کو اسلام پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ رسالے صرف مسلمانوں کی طرف داری میں ہی لکھے گئے تھے نہ کہ انگریزوں کی حمایت میں۔ اس بارے میں سرسیّد لکھتے ہیں:۔

''ہاں یہ بات تو مجبوری کی ہے کہ میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور میں
بلا شبہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں ہی کا ذکرِ خیر اس کتاب میں لکھتا ہوں۔''[31]

سرسیّد کس طرح ہر موقعہ اور ہر مقام پر مسلمانوں کو بچانے کے لیئے آگے بڑھتے تھے اور اُن کی ڈھال بنتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایام غدر میں کچھ مسلمان علماء نے ایسے مضامین اور رسالے لکھے تھے جن میں عیسائیوں کو نصاریٰ کہا گیا تھا۔ انگریز حاکموں نے اس بات کا بہت بُرا مانا۔ انہوں نے سمجھا جس طرح یہودی حقارت سے حضرت عیسیٰ کو ناصری کہتے ہیں اسی طرح مسلمان علماء اور ایسے رسائل کے لکھنے والوں نے عیسائیوں کی توہین کی ہے اور یہ لوگ دل سے عیسائیوں کے دشمن ہیں۔ انگریزوں کا ردِعمل اتنا شدید تھا کہ بعض ایسے علماء اور مصنفین کو جنہوں نے عیسائیوں کو نصاریٰ لکھا تھا پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ سرسیّد نے اس مصیبت سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیئے فی الفور ایک رسالہ نصاریٰ کے لفظ کی تحقیق میں لکھا اور یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں نے جو عیسائیوں کو نصاریٰ لکھا ہے تو اس کی بنیاد ناصری کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ نصر سے مشتق ہے اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہے اس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں نہ کہ ناصرہ سے۔ قرآن میں کہیں ناصرہ کے قریہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کے نصاریٰ ہونے کا بیان اس طرح آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے کہا ''من انصاری الی اللہ'' تو حواریوں نے کہا'' نحن انصار اللہ'' اور اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے والوں کو اسی صفت کے ساتھ جس کی حامی خود اُن کے حواریوں نے بھری تھی موصوف کیا گیا ہے۔ سورہ المائدہ میں ارشادِ ربانی ہے کہ ''اے محمد ﷺ! تو پائے گا اہلِ کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا دوست ان کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں۔''

سرسیّد نے لفظ نصاریٰ کی تحقیق پر اپنے مضمون کا ترجمہ انگریزی میں کرایا اور سب انگریز حاکموں کو اس کی نقل بھیجی۔ اُردو اور انگریزی میں یہ مضمون اخبارات میں بھی چھپوایا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد لفظ نصاریٰ کا قضیہ ختم ہوا اور اس بنا پر مسلمانوں کو سزائیں دینے کا سلسلہ بند ہوا۔

سرسیّد کی ہمہ گیر اور مختلف الجہات قومی جدو جہد پر مولانا اصلاح الدین احمد نے کیسا صحیح اور کیا خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔

''ایک معرکۂ عظیم ہے جس کے مختلف محاذوں پر بیک وقت یورش بھی جاری ہے
اور دفاع بھی۔ اور بڈھا سپہ سالار ایک ہاتھ میں دُوربین اور دوسرے میں
شمشیرِ عمل لیئے ہر مورچے پر مثلِ برق پہنچتا اور مثال ابر گرجتا ہے۔''[32]

ایک اہم واقعہ جس سے سرسیّد کے حُسنِ انتظام ان کی عالی ہمتی اور انسانی ہمدردی کے جذبۂ فراواں کا ثبوت بہم پہنچتا ہے 1860ء میں ہندوستان کے شمال مغربی اضلاع میں رونما ہونے والے سخت قحط سے متعلق ہے۔ مسٹر اسٹریچی نے جو اس وقت مراد آباد کا کلکٹر یعنی ڈپٹی کمشنر تھا اور سرسیّد کی خوبیوں کا معترف تھا ضرورت مندوں کو خوراک بہم پہنچانے کا سارا انتظام وانصرام سرسیّد کے سپرد کر دیا۔ مراد آباد میں ایک محتاج خانہ قائم کیا گیا جس میں ہر روز تقریباً چودہ ہزار محتاجوں کو کھانا کھلایا جاتا۔ سرسیّد نے اس خوبی سے اس کا انتظام کیا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر چودہ ہزار نفوس کو نہایت آرام وسکون سے کھانا تقسیم ہو جاتا۔ بیماروں اور زچہ بچہ کے لئے کھانا الگ تیار ہوتا، بیماروں اور مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے سرکاری ڈاکٹر ہر روز محتاج خانے میں حاضری دیتا۔ سرسیّد خود صبح وشام ہر روز دو دفعہ محتاج خانے کا چکر لگاتے اور اپنے سامنے کھانا بٹتے ہوئے دیکھتے۔ بیماروں کی مزاج پرسی کرتے ان کے بستروں کی چادریں اور ان کے کپڑے اپنے سامنے بدلواتے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں سے ایک جیسا سلوک کرتے۔ دونوں کے لئے کھانا تیار کرنے کا انتظام الگ الگ تھا۔ مراد آباد کی جو پردہ نشین عورتیں لاوارث تھیں اور محتاج خانے میں نہیں آسکتی تھیں ان سب کو کھانا اُن کے گھر بھجواتے۔ محتاج خانے میں مقیم جو لوگ صحت مند تھے اور کام کاج کے قابل تھے ان سے باقاعدہ کام لیا جاتا۔ کچھ تو باہر سڑکوں اور گلیوں کی مرمتی کے کام میں لگائے جاتے، باقیوں کو محتاج خانے میں ہی رسیاں اور سوت بٹنے کا کام دیا جاتا۔ اس طرح کی محنت مزدوری سے جو آمدنی ہوتی وہ محتاج خانے کے استعمال میں آتی۔ سرکاری اخراجات میں جو قحط کی مد میں اُٹھ رہے تھے خاصی کمی آگئی۔ جتنی کم رقم میں اور جس خُوبی سے مراد آباد میں محتاج خانہ کا بندوبست ہوا اس کی مثال اور کسی ضلع میں نہیں ملتی۔ گورنمنٹ سے چِٹھی جاری ہوئی کہ سب ضلعوں میں قحط سے نپٹنے کا انتظام مراد آباد جیسا کیا جائے، مسٹر اسٹریچی کو اس حسنِ انتظام پر تعریفی سرٹیفکیٹ ملا۔ اُس نے گورنمنٹ کو لکھا کہ اس تعریف وتحسین کا حقدار سیّد احمد خان ہے۔

سرسیّد کو ہمیشہ اپنے دِین کی پاسداری اور مسلمانوں کی عزت وحمیت کا خیال رہتا تھا۔ محتاج خانہ کا انتظام انہوں نے کلکٹر صاحب بہادر سے یہ شرط منوا کر اپنے ہاتھ میں لیا تھا کہ جو لاوارث مسلمان بچے آئیں گے انہیں مشنریوں کے سپرد نہیں کیا جائے گا، بلکہ انہیں کھاتے پیتے مسلمان گھرانوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اسی طرح ہندو لاوارث بچے ہندوؤں کے حوالے کیے جائیں گے۔ یہ اہتمام سرسیّد کی وجہ سے صرف مراد آباد کے ضلع میں ہوا اور نہ دوسری جگہوں میں مشنری عیسائی لاوارث بچوں کو اپنی تحویل میں لے لیتے تھے اور عیسائی بنا دیتے تھے۔

تاریخِ فیروز شاہی

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے سرسیّد کو لکھا کہ سوسائٹی ضیاء الدین برنی کی مشہور تصنیف تاریخ فیروز شاہی شائع کرنا چاہتی ہے مگر کوئی مستند اور صحیح نسخہ دستیاب نہیں ہو رہا اگر سرسیّد اس کا ایک تصحیح شدہ نسخہ مہیا کر دیں تو یہ ایک بڑی علمی خدمت ہوگی اور ایک نادر تاریخی ادب پارے کی اشاعت کا بندوبست ہو جائے گا۔ سرسیّد کی طبیعت میں تصنیف و تالیف کا جو ایک لپکا ہمیشہ موجود رہتا تھا اس نے انہیں اس کام کی جانب متوجہ کیا۔ سرسیّد نے ہندوستان کے مختلف مقامات سے تاریخ فیروز شاہی کے چار مختلف نسخے حاصل کیے اور ان کے تقابلی جائزے سے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کو اس کتاب کا ایک مستند اور تصحیح شدہ نسخہ تیار کر کے دے دیا۔ تاریخِ ہند کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں تاریخ فیروز شاہی ایک بلند معیار کی مستند تاریخ ہے سرسیّد نے کتاب پر ایک مبسوط اور مفصل دیباچہ بھی تحریر کر دیا جو بعد میں ان کے جاری کردہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اخبار میں بھی شائع ہوا۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین نفرت اور تعصب ختم کرنے کی کوششیں

(تبیین الکلام)

سرسیّد اپنی نوعمری کے زمانے سے دیکھتے چلے آرہے تھے کہ مشنری ہندوستان کے طول وعرض میں ہر طرف پھیل گئے ہیں اور مسلمانوں سے مباحثے اور مناظرے کرتے پھرتے ہیں۔ مسلمان علماء بھی زبانی اور تحریری بحث مباحثے اور مناظروں میں ان سے پیچھے نہیں تھے۔ ان مسلمان علماء کے مناظروں ہی کی وجہ سے بہت سے مسلمان عیسائی ہونے سے بچ گئے۔ مگر ان مناظروں اور مباحثوں میں یہ خرابی تھی اور ہے کہ اس سے فریقین میں تلخی پیدا ہوتی ہے چنانچہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان نفرت اور اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع اور گہری ہو رہی تھی، جب کہ سرسیّد اپنے مطالعے اور فہم سے یہ سمجھتے تھے کہ ان دونوں فرقوں کے عقائد میں اتنے اختلافات نہیں ہیں جتنے کہ دونوں طرف کے مولویوں نے بنا رکھے ہیں۔ ان کو خیال آیا کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس سے ثابت ہو کہ بائبل اور قرآن، دونوں آسمانی کتابیں، بیشتر معاملات اور اکثر نکات میں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ خود بائبل سے قرآنِ حکیم کے آسمانی کتاب ہونے کی تائید ہوتی ہے اور قرآنِ حکیم کی بہت سی آیات بائبل کے حق میں گواہی دیتی ہیں یہ جو مسلمان علماء تحریفِ لفظی کی بنیاد پر موجودہ بائبل کو سراسر غلط سمجھتے ہیں یا عیسائی علماء جو قرآنِ حکیم کو سرے سے آسمانی کتاب ماننے سے ہی انکاری ہیں سرسیّد چاہتے تھے کہ ان دونوں کی گمراہی کی اصلاح کی جائے۔ اس موضوع پر لکھنے کے لیئے سرسیّد نے بڑی محنت سے بائبل کا تفصیلی مطالعہ کیا بائبل پر لکھی ہوئی کئی تفسیریں پڑھیں۔ اس سلسلے میں سرسیّد کے شوق اور محنت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے عبرانی زبان سے بھی واقفیت پیدا کی تا کہ بائبل کو اصل عبرانی زبان میں پڑھیں اور یہ دیکھیں کہ عیسائیوں نے اس کی تفہیم میں کہاں کہاں غلطی کا ارتکاب کیا ہے؟ اسی طرح مسلمان نسخ کے قائل ہیں۔ حالانکہ جیسے سرسیّد نے اس سلسلے میں اپنی کتاب تبیین الکلام اور بعد میں خطباتِ احمدیہ میں ثابت کیا ہے قرآنِ پاک کی کوئی آیت

منسوخ نہیں ہوئی۔ پس ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے اور عیسائیت اور اسلام کی ایک دوسرے کے ساتھ موافقت ثابت کرنے کے لئے سر سیّد نے ایک مفصل اور مبسوط تصنیف تبیین الکلام کے نام سے لکھنا شروع کر دی۔ اس کی پہلی جلد اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپوائی گئی بائبل کے مشہور سکالر جان میولسن آرنلڈ کے خط کے جواب میں سر سیّد نے اُن کو جو خط لکھا اور جسے آرنلڈ نے اپنی کتاب قرآن اینڈ بائبل میں شامل کیا اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے کیونکہ اس خط سے سر سیّد کے اس سارے منصوبے اور اغراض و مقاصد پر روشنی پڑتی ہے سر سیّد نے آرنلڈ صاحب کو لکھا۔

''بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی۔ خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آباؤاجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو اَمر کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ سے ایک بے کار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں اور ان کے اس مُضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملتی ہے ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو اور دونوں کے دل بُرے ہوں اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ جب کہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ بآسانی خیال کر سکتے ہیں اور نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد انجیل مقدس کی تفسیر لکھنا اس کی تائید کرنا اور اس کو آسمانی کتاب ماننا ہو تو اس کی حالت اور منزلت اس کے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہو گی؟ بلاشبہ اس سے سب لوگ متنفر ہوں گے اور اس کو بُرا کہیں گے۔ یہی حالت میری ہوئی مگر میں نے ان کی بے جا تضحیک، بے بنیاد دھمکیوں اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اس بات کے کہنے میں جس کو میں حق سمجھتا تھا کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا۔ جو انعام مجھ کو عیسائیوں سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اس سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے مجھ کو دیا مگر خدا کا شکر ہے کہ میری تفسیر کا حصۂ اوّل چھپنے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا۔ وہ خود قرآن پاک اور دیگر مستند

کتابوں کی بنا پر تھا۔ بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیل مقدس پر اعتقاد رکھنے اور اس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہو گئے اور وہ بہت سے توہمات اور خیالاتِ فاسد جو ان کو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہو گئے۔ جیسا کہ آپ کو ذیل کے فقرات سے معلوم ہو گا جن کو میں ایک بڑے مولوی کے خط سے جو میرے نام تھا نقل کرتا ہوں۔ ''میں نے آپ کی تفسیر کو پڑھا اور میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ بلاشک وہ بے مثل کتاب ہے اور مذہب اِسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے اور بے حد شکر ہے کہ اس زمانہ میں آپ ایک ایسے شخص ہیں جو راہِ راست کی رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ کے واسطے دل سے دُعا نکلتی ہے۔''

''بائبل مقدس میں بعض مقامات ایسے ہیں جس کی وجہ سے مسلمان اس سے بہت بد اعتقاد ہو گئے تھے مثلاً ابراہیمؑ کی طرف مصر میں جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا، عیسائی مفسروں نے ان مقامات کی پوری تفسیر نہیں کی لیکن میں برخلاف ان سے کہتا ہوں کہ خود بائبل سے ان فقروں کے یہ معنی نہیں نکلتے جو عموماً مانے جاتے ہیں۔''

''بایں ہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھے نجات نہ ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کہ جس طرح انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لیے کہ میں انجیل میں کہیں اس کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے کہ مذہب اِسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لیے مجھے کچھ پروا نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں۔ میں حق پر ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے رُوبرو سب کو ایک دِن جانا ہے۔ البتہ میری یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآنِ پاک کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔ میری یہ خواہش ان چند رسالوں کے پڑھنے سے آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائے گی جو میں نے اس باب میں لکھے

ہیں اور جواب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نے آپ کے نام اپنی تفسیر کا پہلا حصہ بھی روانہ کیا ہے۔''[33]

اس ضمن میں فرانس کا معروف مستشرق موسیو گارسن دتاسی جس نے اُردو لٹریچر کے مطالعہ اور تحقیق میں عمر صرف کی ہے 1883ء کے ایک لیکچر میں سرسیّد کی اس تفسیر (تبیین الکلام) کے متعلق کہتا ہے۔

''ایک نئی کتاب جس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں وہ سیّد احمد خان کی تصنیف ہے جو زمانہ حال کے ہندوستانی مصنفوں میں سب سے زیادہ مشہور مصنف ہے۔ یہی وہ مصنف ہے جس کی کتاب ''آثار الصنادید'' کا میں نے پیرس کے ایشیا ٹک جرنل میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے اس کتاب (تبیین الکلام) کے عنقریب چھپنے کی پہلے خبر دی تھی اور اب میں خوشی سے اطلاع دیتا ہوں کہ اس کا پہلا حصہ چھپ گیا ہے۔ جس کی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے جو مصنف نے مہربانی کر کے ہدیۃً بھیجی ہے۔ اس کتاب سے صرف یہی نہیں پایا جاتا کہ سیّد احمد خان کو قرآن شریف اور ہماری کتب مقدسہ کا پورا پورا علم ہے بلکہ بہت سی ایشیائی تصانیف اور طرفہ تر یہ کہ بہت سی یورپین تصانیف سے ان کو پوری پوری واقفیت ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا انہوں نے غور وخوض سے مطالعہ کیا ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب وسیع علم کا نتیجہ ہے اور میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب اس زبان میں (یعنی اُردو میں) لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اُردو میں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی مبسوط اور مکمل بحث کی ہو۔''[34]

مراد آباد میں 1861ء (بمطابق 1278ھ) میں سرسیّد کی بیگم دو بیٹے سیّد حامد اور سیّد محمود اور ایک چھوٹی بیٹی اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ کر اگلے جہاں سدھار گئیں۔ اُس وقت سرسیّد کی عمر 44 سال کی تھی دوست احباب نے بڑا کہا کہ شادی کر لو زندگی کا لمبا سفر تنہا کیونکر کٹے گا مگر سرسیّد کے دل میں قومی کاموں کی جو دُھن سمائی تھی وہ انہیں کسی اور طرف متوجہ ہونے کی کب مہلت دیتی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ 37 سالوں کے شب وروز اپنے ہم مذہبوں اور ہم وطنوں کی نذر کر دیئے۔

سائنٹیفک سوسائٹی

12 مئی 1862ء کو سرسیّد کا تبادلہ مراد آباد سے غازی پور ہو گیا۔ سرسیّد کے دل میں آہستہ آہستہ یہ خیال جاگزیں ہو رہا تھا کہ جب تک ہندوستان کے لوگوں میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی ان کے ترقی کرنے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ مسلمان تعصب کی وجہ سے انگریزی سیکھنے کی جانب مائل نہیں ہو رہے تھے اور ہندو بھی اس حد تک ہی انگریزی میں دلچسپی لیتے تھے جس قدر انگریزی کی ضرورت انہیں مختلف دفاتر میں ملازمتیں حاصل کرنے کے لیئے تھی۔ انگریزی میں جو علمی اور سائنسی خزانے دستیاب تھے ان کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ اہلِ ہند کو علومِ جدیدہ سے روشناس کرانے کی غرض سے سرسیّد نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا جائے جو اہم علمی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کروائے اور ان کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کرے۔ چنانچہ سرسیّد کی کوششوں سے سائنٹیفک سوسائٹی 1863ء میں غازی پور میں قائم ہوئی اس وقت کے وزیرِ ہند کو اس کا پیٹرن یعنی مُربی بنایا گیا پنجاب اور یو پی کے گورنر اس کے وائس پیٹرن بنے۔ ملک بھر سے رئیس اور علم دوست حضرات کو اس کا ممبر بنایا گیا۔ سرسیّد اگرچہ اس سوسائٹی کے رُوحِ رواں تھے مگر انہوں نے خود کو سوسائٹی کا آنریری سیکرٹری کہلوانا پسند کیا۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی تشہیر کی غرض سے سرسیّد کلکتہ گئے۔ وہاں متعدد تقریبات میں اس موضوع پر تقریریں کیں اور سامعین کو اس سوسائٹی کی غرض و غایت سے آگاہ کیا کلکتہ کے سفر کے دوران راستے میں جو شہر پڑے وہاں بھی رُکے اور ہر جگہ لوگوں کو سوسائٹی سے متعارف کروایا۔ غازی پور میں سوسائٹی کے اجلاس منعقد ہونے لگے اور متعدد اہم انگریزی کتابوں کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔

سرسیّد نے غازی پور میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ مدرسے اور سوسائٹی کی غرض و غایت ایک ہی تھی کہ لوگوں میں تعلیم عام ہو۔ علومِ جدیدہ کی روشنی پھیلے اور قومی اور سماجی شعور پروان چڑھے۔ یہ مدرسہ اُنہی خطوط پر قائم کیا گیا جن پر آگے چل کر علی گڑھ میں سرسیّد نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی۔ اُردو،

عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت سب زبانوں کی تعلیم و تدریس کا بندوبست اس مدرسے میں کیا گیا۔ مدرسے کی تعمیر کے لئے سرسیّد نے چندہ اکٹھا کیا۔ 80ہزار روپے میں ایک عالی شان عمارت بن گئی۔ جو اب تک قائم ہے۔ اس مدرسے کا موجودہ نام وکٹوریہ ہائی سکول ہے۔

1864ء میں سرسیّد کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہو گیا اور وہ اس جگہ پہنچ گئے، جس جگہ نے سرسیّد کے کارناموں کی وجہ سے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کرنا تھی۔ علی گڑھ جاتے ہوئے وہ سائنٹیفک سوسائٹی کا دفتر بھی اپنے ساتھ لے گئے اور علی گڑھ اور گردونواح کے رئیسوں سے چندہ اکٹھا کر کے ایک عالی شان عمارت سوسائٹی کے دفتر کے لئے تعمیر کی۔ یہ عمارت ایک وسیع احاطہ میں تعمیر کی گئی اور اس کے سامنے ایک خوبصورت سبزہ زار اور چمن کا اہتمام بھی کیا گیا۔ سوسائٹی کے اس مرکزی دفتر کا افتتاح کرتے ہوئے شمال مغربی علاقہ جات کے لیفٹیننٹ گورنر نے اپنی تقریر میں سرسیّد احمد خان کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

> ''سیّد احمد خان کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے۔ تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انہی کا کام ہے اور وہی اس کے ترقی دینے والے ہیں اور اس عمارت کے جس کو کھولنے کے لئے آج ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، وہی اس کے بانی ہیں...... اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سیّد احمد خان نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں پر اس کا اثر ضرور ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ انسٹیٹیوٹ اس بات کا سبب ہو کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سیّد احمد خان کی بڑی خواہش ہے پس آؤ ہم سب ان کی مدد کریں۔ اے خدا اس انسٹیٹیوٹ کو سرسبز کر۔''[35]

سائنٹیفک سوسائٹی کے اس عظیم الشان انسٹیٹیوٹ میں ہر ماہ کئی علمی اجلاس اور مذاکرے منعقد ہوتے۔ مختلف موضوعات پر لیکچروں کا بندوبست کیا جاتا۔ سائنسی آلات کی مدد سے مختلف سائنسی علوم کی وضاحت اور تشریح کی جاتی۔ بہت سی کتابوں کے تراجم اس انسٹیٹیوٹ کے زیرِ اہتمام اور نگرانی میں کرائے گئے۔ مفید علمی کتابوں کی ایک لائبریری اس انسٹیٹیوٹ میں قائم کی گئی۔ غرض یہ ادارہ ایک طرح سے ہندوستان کا مرکزِ علم و دانش بن گیا۔ اس کے لئے اہلِ ثروت نے دل کھول کر چندہ دیا۔ سرسیّد

نے تو اپنا تن من دھن پہلے ہی اس کی ترقی و ترویج میں صرف کر رکھا تھا۔ حالی لکھتے ہیں کہ رئیسہ بھوپال نواب سکندر بیگم صاحبہ نے سرسیّد کی خدمات کے اعتراف میں ایک قیمتی انگوٹھی بطور تحفہ بھیجی۔ سرسیّد نے اُسے ایک ہزار روپے میں بیچ کر ساری رقم انسٹیٹیوٹ کے فنڈ میں دے دی۔ سرسیّد کا اپنا پریس تھا جو اُنہوں نے آٹھ ہزار روپے کے زرِ کثیر سے تبیین الکلام کی طباعت کے لیئے خاص طور پر خریدا تھا۔ وہ بھی انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی انسٹیٹیوٹ کے حوالے کر دیا۔ سوسائٹی کی کتابیں، اس کے اخبار، رسالے اور اطلاع نامے اِسی پریس میں چھپنے لگے۔ اس ادارے کی کارکردگی کی وُسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے دارالمطالعہ میں لندن اور ہندوستان کے اطراف و جوانب سے 18 انگریزی اور 26 اُردو اخبارات و رسائل آتے تھے۔ یہ ادارہ علم و حکمت کی ایک ایسی شمع تھی جس کی شعاعیں ملک بھر کے اہلِ بصیرت تک پہنچنے لگیں۔

علی گڑھ اخبار

اہلِ فکر ونظر کو سائنٹیفک سوسائٹی کی سرگرمیوں سے آگاہ رکھنے کے لیئے اور سوسائٹی کے اغراض ومقاصد کی موثر اشاعت بلکہ ان اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے سرسیّد نے سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف سے ایک اخبار علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ نکالا۔ جسے عرفِ عام میں علی گڑھ گزٹ یا علی گڑھ اخبار کہتے تھے۔ پہلے یہ اخبار ہفتہ وار تھا پھر ہفتے میں دو بار نکلنے لگا۔ سرسیّد خود اس کا اداریہ لکھتے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے مذاکرات اور اجلاس میں پڑھے جانے والے مقالات اور انسٹیٹیوٹ کے جملہ معاملات اور سرگرمیوں کے علاوہ اس میں ہر طرح کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ہر طرح کی مستند اور مصدقہ خبریں بھی اس میں جگہ پاتیں اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کئی کالم انگریزی میں بھی چھپتے۔ بسا اوقات ایک ہی مضمون اُردو اور انگریزی دونوں میں شائع کیا جاتا۔ اس طرح یہ اخبار یکساں طور پر انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ رفتہ رفتہ علی گڑھ گزٹ ملک کا اہم ترین اخبار بن گیا۔ گورنمنٹ کے ہر دفتر میں علی گڑھ گزٹ شوق سے پڑھا جاتا۔ عوام کے مسائل اور حکومت کے خلاف لوگوں کی شکایات اس اخبار میں ایسے انداز سے شائع کی جاتیں جن سے حکومتی حلقوں میں مخالفانہ کے بجائے ہمدردانہ ردِعمل پیدا ہوتا۔ اخبار کی پالیسی ایسی تھی کہ عوام اور حکومت دونوں اس اخبار کو اپنا خیر خواہ سمجھتے تھے۔ حالؔی نے کیا خوب لکھا ہے کہ:

> ''اس اخبار نے اپنے معتدل روّیے سے سب پر ظاہر کر دیا کہ سچی آزادی اپنی آزادی کو ہمیشہ کے لیئے برقرار رکھنا ہے، نہ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت اس کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھنا۔''

اس اخبار کا ایک اور بڑا وصف یہ تھا کہ یہ کسی فرقے یا کسی فرد کی دل آزاری کا مرتکب کبھی نہ ہوا۔ ہندوستان کی ہر قوم اور ہر فرقے کے زُعماء کی خبریں

عزت واحترام کے ساتھ شائع کرتا۔ اختلاف وافتراق کی کوئی خبر اس میں لگتی
بھی تو صلح جوئی اور اصلاح کا انداز لیئے ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرقے کے لوگ
اسے اپنا اخبار سمجھتے تھے۔ یہ اپنے دور کا سب سے بڑا اخبار بن گیا۔ محض اشاعت
کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ اثر ورسوخ کے اعتبار سے بھی یہ سب سے مؤقر اخبار
تھا۔ حالؔی کے الفاظ میں ''اس کی آواز ہمارے عام دیسی اخباروں کی طرح کوئی
معمولی آواز نہ تھی بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ہمیشہ اس کی
آواز پر کان لگائے جاتے تھے اور اس کو غور سے سنا جاتا تھا اور اس کا سبب اس
کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اس کا لکھنے والا اور اہتمام کرنے والا سیّد احمد خان تھا۔''[36]

سرسیّد نے اس اخبار کا آغاز 1866ء میں کیا اور یہ اخبار بغیر کسی تعطل یا وقفہ کے باقاعدہ 1898ء میں سرسیّد کی وفات تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ 32 سال علی گڑھ گزٹ کا باقاعدگی سے اپنے وقت پر شائع ہوتے رہنا سرسیّد کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ان کے کئی دوسرے اہم قومی کارناموں کی بلند آہنگ گونج میں قدرے دب کر رہ گیا ہے۔ سرسیّد کو اس لحاظ سے اُردو صحافت میں بھی اوّلیت کا درجہ حاصل ہے اس طرح کا غیر جانبدار بے لاگ اور مستند اخبار نکالنا جس کو ہر طبقہ کے لوگ عزیز رکھتے ہوں انہی کا کام تھا۔

برصغیر پاک وہند کی انتظامیہ کی ذمہ داری برطانوی حکومت نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل ختم ہو چکا تھا۔ سرسیّد احمد خان نے محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ اب وہ اپنا رابطہ کسی نہ کسی صورت برطانیہ کے ارکانِ پارلیمنٹ سے قائم کریں تاکہ ہندوستان کے بارے میں مختلف فیصلے کرتے وقت برطانیہ کا دارالعوام ہندوستان کے حالات اور ہندوستانیوں کے احساسات و جذبات سے کماحقہٗ آگاہ ہوتا رہے۔ اس مقصد کے لئے 1866ء میں سرسیّد نے ایک ایسوسی ایشن بنائی جس کا نام علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب سرسیّد کا ذہن سیاست کی وادیٔ پُر خار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہر چند کہ یہ ایسوسی ایشن رفاہ عامہ کے لیئے قائم کی گئی تھی اور اس کا مقصد برطانیہ کے ارکانِ پارلیمنٹ اور اہلِ سیاست کو ہندوستانی عوام کی مشکلات اور مسائل سے آگاہ کرنا تھا اور ان مشکلات ومسائل کے تدارک کے حق میں ان کی رائے ہموار کرنا تھا مگر یہ ایک ایسی سرگرمی تھی جس کی سرحدیں میدانِ سیاست سے جا ملتی ہیں۔ آگے چل کر سرسیّد نے نمایاں طور پر برصغیر پاک وہند

کے عوام کی سیاسی راہ نمائی کا جو اہم فریضہ ادا کرنا تھا شاید یہ اس کا حرفِ آغاز تھا۔ اس ایسوی ایشن نے کئی مسائل پر عرضداشتیں لندن بھجوائیں۔ ریلوے کے سفر میں مسافروں کو اوّل اوّل جو مشکلات پیش آتی تھیں وہ دُور کروائیں۔ کتابوں اور رسائل کی بذریعہ ڈاک ترسیل پر جو خرچ اُٹھتا تھا اس میں کمی کرائی، مگر اس کی اصل اہمیت سرسیّد کے نقطۂ نظر میں اس رُجحان کی ہے، جس کی نشاندہی اس ایسوی ایشن کے قیام سے ہوتی ہے۔

اگست 1867ء میں سرسیّد کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس ہوگیا۔ انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کا کام اپنے عزیز دوست راجہ جے کشن داس کے سپرد کیا اور خود بنارس کو سدھارے۔ راجہ جے کشن داس سے سرسیّد کی دوستی ان کے قیام مراد آباد کے دوران ہوئی تھی۔ سرسیّد نے وہاں جس بے لوث طریقے پر قحط کے دنوں میں محتاج خانے کا انتظام چلایا اور جس غیر متعصبانہ طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی یکساں طور پر خدمت کی اس سے راجہ جے کشن داس دل و جان سے سرسیّد کی انسانی عظمت کا قائل ہوگیا اور پھر زندگی بھر کے لیئے ان سے اخلاص و محبت کا رشتہ استوار کرلیا۔ بنارس جاتے ہوئے جو کام سرسیّد نے راجہ جے کشن داس کے سپرد کیا اس کام کی نگرانی اور دیکھ بھال میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سوسائٹی کے علی گڑھ گزٹ کے لیئے سرسیّد بنارس سے باقاعدہ اداریے اور مضامین لکھ کر بھیجتے رہے اور اخبار کے معیار اور اس کی رفتار میں کوئی فرق نہ پڑا۔

اُردو ھندی تنازع

بنارس میں ایک سال سات ماہ کے قیام کے بعد سرسیّد نے انگلستان جانے کا ارادہ کیا۔ اس مختصر سے قیامِ بنارس کے دوران وہ مشہور واقعہ پیش آیا جسے تاریخ میں ''اُردو ہندی جھگڑے'' کا نام دیا گیا ہے مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کا جو رویہ عمومی طور پر پنپ رہا تھا ان میں جس شدت سے مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ تعصب راہ پا رہا تھا، اس سے سرسیّد کے جذبات کو بڑا دھچکا لگا۔ انہوں نے ہمیشہ ہندوستانیوں کی بات کی تھی۔ جو بہتری اور ترقی مسلمانوں کے لئے چاہی تھی اُس کی خواہش ہندوؤں کے لئے بھی کی تھی وہ ان دونوں قوموں کو اپنی دو آنکھوں سے تشبیہ دیا کرتے تھے مگر جب سے مسلمان اقتدار سے محروم ہوئے تھے ہندوؤں کے تیور بدلنے شروع ہو گئے تھے۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں ہندو مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کا وجود گویا آٹے میں نمک کے برابر رہ گیا تھا مسلمان اپنے زوال کے بعد اور خاص کر 1857ء کے سانحۂ جانکاہ کے نتیجے میں خود اپنی ہی زخمی اَنا کے غار میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ انہیں اگر تسکین ملتی تھی تو بس اپنی عظمتِ رفتہ کے خیال و خواب میں ہی ملتی تھی۔ نئی صورتِ حال سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت ان میں نہ تھی۔ پھر مذہب کی گمراہ کن تعبیر و تفہیم نے انہیں مزید غفلت اور جہالت میں مبتلا کر رکھا تھا وہ انگریزوں کی طرح انگریزی زبان کو بھی اپنا دُشمن سمجھنے لگے تھے۔ مسلمانوں کے اس ادبار اور کسمپرسی پر ہندوؤں کا، جن پر انہوں نے مسلسل ایک ہزار سال حکومت کی تھی خوش ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ وہ مسلمانوں کے رہے سہے وجود کے درپے ہو گئے اور ہر اس چیز کی مخالفت کرنے لگے جس کا تعلق مسلمانوں کے دورِ حکومت سے تھا اُردو زبان ہندی بھاشا کی ہی ایک ترقی یافتہ صورت تھی اس میں اگرچہ عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش تھی مگر اُردو بہر حال سارے ہندوستان کی زبان تھی۔ اسی بنا پر 1835ء میں انگریزوں نے لارڈ میکالے کی تعلیمی سفارشات کے نتیجے میں اُردو کو ہی ذریعہ تعلیم بنایا تھا اور دفتری اور عدالتی کاروائی اُردو میں شروع کر دی تھی اس سے

پہلے فارسی رائج تھی۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر ہندو اُردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے۔ 1867ء میں بنارس کے کچھ ہندو رئیسوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد یہ تھا کہ سکولوں، دفتروں اور عدالتوں میں اُردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان رائج کروانے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں کمیٹی نے گورنمنٹ کو یاداشتیں بھیجیں اور بنگال کی مثال دے کر حکومت پر واضح کیا کہ جس طرح بنگالہ میں مدرسوں، دفتروں اور عدالتوں کی زبان بنگلہ ہے اسی طرح باقی سارے ملک میں ہندی کو رائج کیا جانا چاہیئے، حالانکہ ہندی نہ اس وقت کہیں بولی جاتی تھی نہ کوئی اُسے سمجھتا تھا۔ نہ دیوناگری رسم الخط ہی سے لوگ آشنا تھے۔ مگر بنارس کے ہندوؤں نے بڑے زور وشور سے یہ تحریک شروع کر دی۔ اس کوشش میں اُنہیں کامیابی نہ ہوئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا مطالبہ ہی غیر حقیقی اور ناممکن سا تھا۔ ہندی زبان اس قابل ہی نہ تھی کہ اُردو کی جگہ لے سکتی۔ ہندوؤں کے اس بالکل بے جا اور تعصب سے بھرپور مطالبے پر سر سیّد احمد خان نے جو کچھ اس وقت کے بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے کہا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا ہے اور اسی سے دو قومی نظریے کی بنیاد کا سراغ ملتا ہے۔ سر سیّد احمد کے الفاظ ہیں۔

''ان ہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا انہوں نے کہا ''اگر آپ کی یہ پیش گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیش گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔''[37]

ہندوؤں کے جس رویے کے آثار اس وقت اہلِ نظر کو صاف نظر آ رہے تھے، اسکے بارے میں مشہور فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی کے الفاظ جو اس کے اپنے مشاہدے پر مبنی ہیں، ناقابلِ فراموش

ہیں۔اس نے کہا:

''ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں، جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔ اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوالِ سلطنت کے بعد اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں، مگر انہوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہم وطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ہی ایسے ارادے رکھتے ہیں۔''[38]

دفتروں اور سکولوں میں اُردو زبان کو ختم کرنے کی ہندوؤں کی یہ کوشش اگرچہ کامیاب نہ ہوئی مگر وہ وقتاً فوقتاً اس سازش میں لگے رہے۔ ہر ضلع میں ہندو رئیسوں نے اسی طرح کی کمیٹیاں بنالیں، جس طرح کی کمیٹی 1867ء میں بنارس میں بنائی تھی۔ ان تمام کمیٹیوں کا مقصد اُردو کی جگہ ہندی کا نفاذ تھا۔ 1882ء میں جب ایجوکیشن کمیشن بنا تو ہندوؤں نے پھر اُردو کی مخالفت اور ہندی کے حق میں سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ پنجاب اور شمال مغربی اضلاع سے ہندوؤں کی متعدد کمیٹیوں نے ایجوکیشن کمیشن کو لمبی لمبی یادداشتیں اس غرض کے لئے بھیجیں۔ اس کے ردِّعمل کے طور پر سرسیّد کے دوستوں نے لاہور میں ایک انجمن حمایت اُردو قائم کی اور کمیشن پر اپنا موقف واضح کیا۔ سرسیّد اس وقت وائسرائے کی مجلسِ قانون ساز کے رُکن تھے۔ انہوں نے ایجوکیشن کمیشن سے کہا کہ یہ معاملہ سیاسی نوعیت کا ہے اور ایجوکیشن کمیشن سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔

1898ء کے آغاز میں شمال مغربی اضلاع اور اودھ کے ہندوؤں نے یہ معاملہ پھر بڑی شدومد سے اُٹھایا کیونکہ اُس وقت وہاں ایک ایسے لیفٹیننٹ گورنر کا تقرر ہو گیا تھا جس سے ہندو رئیسوں کو کچھ طرف داری کی اُمید تھی۔ سرسیّد اس وقت بیمار تھے مگر بیماری کی حالت میں بھی انہوں نے ایک مدلل مضمون اُردو کے حق میں اور ہندوؤں کی کوششوں کے توڑ میں لکھا جو 19 مارچ 1898ء کے علی گڑھ گزٹ میں سرسیّد کی وفات سے صرف نو دن پہلے شائع ہوا۔ الٰہ آباد میں مسلمانوں نے ہندوؤں کی اس مذموم کوشش کی مخالفت میں جو وہ محض تعصب کی بنا پر کر رہے تھے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ سرسیّد نے مرض الموت کی حالت میں بھی اس کمیٹی کو اپنے مشوروں سے مستفید کیا اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہوسکتا لیکن جہاں تک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔

سفر انگلستان سے پہلے سرسیّد احمد خان کے قیامِ بنارس کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مولویوں کے شوروغل کے جواب میں ایک رسالہ دراحکامِ طعام اہلِ کتاب کے بارے میں لکھا۔ اور آیاتِ قرآنی واحادیث نبویؐ اور فقہی روایات خاص کرشاہ عبدالعزیز کے فتوؤں کی روشنی میں واضح کیا کہ انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے میں کوئی شرعی اَمر مانع نہیں ہے۔ انہی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا انہی کے برتنوں میں کھانا بالکل جائز اور مباح ہے بلکہ انہی کا ذبیحہ کھانے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ البتہ سؤر کا گوشت کھانا اور شراب پینا حرام ہے چاہے یہ کام آپ اُن کی صحبت میں بیٹھ کر کریں یا اپنے گھر بیٹھ کر خلوت میں کریں۔ مسلمانوں کے جاہلانہ تعصب کا یہ حال تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ جو مسلمان انگریزوں کے ساتھ مل بیٹھ کر کھائے پیئے گا کافر ہو جائے گا۔

سفرِ انگلستان

سرسیّد یکم اپریل 1869ء کو بنارس سے لندن کے لیئے روانہ ہوئے۔ مدت سے ان کے دل میں یہ خواہش تھی کہ انگلستان دیکھیں۔ کہتے ہیں

''میری بڑی خواہش تھی کہ میں بھی لندن جاؤں اور تعلیم و تربیت کے اُن طریقوں سے واقف ہوں جن طریقوں سے انگلش قوم نے ایسے اعلیٰ درجے کی ترقی پائی ہے۔''[39]

''ہم لوگ جو گورنمنٹ انگلینڈ کے سائے میں آباد ہیں ان کو اس وقت تک ترقی نہیں ہوسکتی جب تک ہم انگلش نیشن کی عادات اور حالات سے خوب واقف نہ ہوں۔ اسی خیال سے میں نے ولایت کا سفر اختیار کیا تھا اور اس غرض سے کہ اوروں کو بھی اپنی اولاد بھیجنے کی ترغیب ہو اپنے لڑکوں کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔''[40]

سرسیّد کو اپنی یہ خواہش پوری کرنے کے لیئے سفر کا موقع یوں ہاتھ آیا کہ گورنمنٹ نے ان کے بیٹے سیّد محمود کو انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ دے دیا۔ سرسیّد بھی بیٹے کے ساتھ جانے کے لئے کمر بستہ ہو گئے اپنے دوسرے بیٹے سیّد حامد کو اور گھریلو ملازم چھجو کو بھی ساتھ لیا اور بحری جہاز کے ذریعے انگلستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ سفر کا خرچ اور لندن میں قیام و طعام کے اخراجات کی خاطر سرسیّد نے اپنی جائیداد بیچی، اپنا بنگلہ رہن رکھا اور اس کے علاوہ دس ہزار روپے قرض بھی لئے۔ ان کا ارادہ کم از کم سال ڈیڑھ تک انگلستان میں قیام کرنے کا تھا۔ اتنا طویل قیام انگلش قوم کے حالات اور اُن کی عادات اور وہاں کے تعلیم و تربیت کے طور طریقوں سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے تو درکار نہ تھا۔ اصل میں سرسیّد کے ذہن میں ایک اور منصوبہ بھی تھا۔ جب سے سرولیم میور نے اپنی ضخیم کتاب لائف آف محمد ﷺ لکھی تھی، سرسیّد کو ایک پل چین نہ تھا۔ ان کو اس خیال نے بے قرار کر رکھا تھا کہ کسی طرح وہ

سروليم میور کے ان بے بنیاد الزامات کا مفصل اور مدلل جواب لکھیں اوران کا توڑ کریں جو اس نے اپنی کتاب میں آنحضرت ﷺ پر لگائے تھے۔ اس مقصد کے لئے ان کا انگلستان جانا اور وہاں قیام کرنا ضروری تھا، کیونکہ سروليم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں جن کتابوں کا حوالہ دیا تھا اور جن ماخذوں کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا تھا وہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں ہی دستیاب ہو سکتے تھے۔ حالیؔ لکھتے ہیں کہ سروليم میور کی کتاب کے بعض مندرجات نے سر سیّد کو اس قدر مضطرب کر دیا تھا کہ انہوں نے اس کا جواب لکھنے کی فکر میں کئی راتیں بے چینی میں گزاریں۔

سر سیّد دورانِ سفر اور پھر انگلستان پہنچ کر اپنے سفر کا حال بڑے مفصل اور دلچسپ انداز میں رقم کرتے رہے۔ یہ سفرنامہ قسط وار علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے لفظ لفظ سے سر سیّد کی اپنی قوم سے بے پناہ ہمدردی اور وطن سے محبت کا جذبہ ٹپکتا ہے۔ جس صورت حال کا نقشہ وہ اپنے الفاظ میں کھینچتے ہیں اس کا مقابلہ ہندوستان کے حالات سے کرتے ہیں۔ دوسروں کی خوشحالی، سلیقہ مندی، شائستگی اور طرزِ معاشرت کی عمدگی پر رشک کرتے ہیں اور اپنے ہاں کی غربت، جہالت، خود غرضی، بے سلیقگی اور فضول رسومات وتوہمات پر ان کا دل کڑھتا ہے۔ وہ جگہ جگہ دوسروں کی حب الوطنی کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ نہر سویز پر سے گزرے تو فرانسیسی انجینئر لسپس کا جس نے نہر سویز بنائی تھی، یہ واقعہ بیان کیا کہ نہر سویز کی افتتاحی تقریب میں جب کہا گیا کہ لسپس کے کمال ہنر مندی کے اعتراف کے طور پر نہر کا نام نہر لسپس رکھنا چاہیئے تو اس فرانسیسی انجینئر نے جواب دیا کہ اگر مجھے خراج تحسین پیش کرنا ہے تو میرے وطن کو خراج تحسین پیش کریں اس کا نام نہر فرانس رکھیں۔

سر سیّد نے ہندوستان میں بنارس سے بمبئی بلکہ عدن تک ہر جگہ اُردو کا چلن دیکھا اور اس بات کو بطورِ خاص اپنے سفر کے حال میں بیان کیا۔ لکھتے ہیں:

> "بندہ نے الہ آباد سے بمبئی تک، کیا گاؤں میں اور کیا چوکیات میں کیا ریل پر اور کیا گورنمنٹ کے اہل کاروں اور ہر ایک محکمہ کے چپڑاسیوں اور ہر ایک جگہ کے قلیوں سے اُردو میں گفتگو کی۔ سب لوگ ہر جگہ بخوبی سمجھتے تھے اور اُردو ہی میں جواب دیتے تھے۔ بعض بعض لفظوں کے مکرر سمجھانے کی اور زیادہ آسان طور پر بیان کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ کچھ شبہ نہیں کہ تمام ہندوستان میں اُردو

زبان اسی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے، جیسے تمام یورپ میں فرنچ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ مروج ہے۔۔۔۔ ممالی قوم کے لوگ بھی کسی قدر اُردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ کوئی ضروری کام بند نہیں رہ سکتا۔ سب اُردو میں انجام ہو سکتا ہے۔ الحمدللہ عدن تک تو اُردو زبان کی شہنشاہی قائم ہے۔''[41]

سر سیّد پھر اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ بنارس کے ہندو اُردو کے بجائے اپنے ہاں ہندی کو رائج کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ہر جگہ انجمنیں اور سبھائیں بنا رہے ہیں۔

سفر کے بیان میں سر سیّد کی طبعی شوخی اور ظرافت برابر اپنا رنگ بھی دکھاتی جاتی ہے۔ شہر سوئیز میں دستور تھا کہ سیاحوں کی سواری کے لیئے وہاں کے لوگ گدھے کرائے پر دیتے تھے۔ اس کا حال یوں لکھا ہے:

''جس وقت کوئی انگریز گدھا کرایہ کرنا چاہتا تھا اس وقت عجیب سیر ہوتی تھی۔ گدھے والوں نے جہاں دیکھا کہ گدھا کرائے کو چاہتے ہیں، دس دس بارہ بارہ آدمی اپنے گدھے لے کر دوڑے اور ہر شخص دوسرے کے گدھے کو دھکے دے کر ہٹاتا ہے، اپنا سامنے کرتا ہے اور چلاتا ہے کہ ''ڈنگی سر، ڈنگی سر'' کبھی یہ کہہ کر چلاتے تھے ''ویری گڈ ڈنگی سر، ویری گڈ ڈنگی سر'' یعنی صاحب بہت اچھا گدھا، صاحب بہت اچھا گدھا۔ اور اس قدر غل ہوتی تھی اور اتنے گدھوں میں آدمی کو گھیر لیتے تھے کہ لینے والا گھبرا جاتا تھا۔ جب تک وہ کسی نہ کسی گدھے پر سوار نہ ہو لے، اس وقت تک وہ اسی آفت میں پڑا رہتا تھا۔''[42]

یورپ کے پہلے شہر مارسیلز کی سیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' کہانیوں میں بھی ایسی کیفیت نہیں سُنی تھی جو آنکھوں نے دیکھی۔'' پیرس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''ہم نے سنا ہے کہ پیرس کے لوگ پیرس نہیں کہتے بلکہ پیراڈائیز کہتے ہیں۔ یعنی بہشت اور کچھ شک نہیں کہ پیرس دُنیا میں بہشت ہے۔''

وارسائے میں کئی نادر عجوبہ رُوزگار تصاویر سر سیّد نے دیکھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کا بطور خاص ذکر کیا۔ یہ تصویر سید عبدالقادر الجزائری کی بیگمات کی تھی۔ سیّد عبدالقادر نے مردانہ وار بہادری سے فرانسیسی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس تصویر میں ایک بیٹھے ہوئے اُونٹ کے کجاوے سے، جسے فرانسیسی سپاہیوں نے اُلٹا دیا تھا، سیّد عبدالقادر کے حرم کی بیگمات کو باہر گرتے ہوئے ایسی حالت میں دکھایا تھا کہ

ان کے بدن سے ملبوس اُتر گیا تھا۔ اردگرد فرانسیسی سپاہی ان نیم برہنہ عورتوں پر سنگینیں تانے کھڑے تھے۔ اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے سرسیّد احمد خان کہتے ہیں کہ کیا یہ فرانس کی بہادری کا منظر ہے؟ یہ تو اہلِ فرانس کے لئے باعثِ شرم ہونا چاہیئے۔ ایسے مناظر کو دیکھ کر ایک غیرت مند مسلمان کا دِل خون کے آنسو روتا ہے۔ کیا کسی مسلمان فوج نے بھی دشمن کی نہتی اور بے بس عورتوں کو کبھی اس طرح ذلیل وخوار کیا ہے؟ اور کیا کسی مسلمان ملک کے عجائب گھر یا وار میوزیم میں بھی کوئی اس طرح کی تصویر ہے؟

4 مئی 1869ء کو سرسیّد احمد خان اپنے تینوں ہمراہیوں سمیت لندن پہنچے۔ تین چار دن چیرنگ کراس ہوٹل میں قیام کیا۔ پھر میکلن برگ سکوائر میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہائش کا اپنا بندوبست کر لیا۔ تقریباً 17 مہینے یہاں رہے۔ کئی انگریز جن کا تعلق لندن کی اشرافیہ سے تھا اور جو ہندوستان میں اہم عہدوں پر فائز رہ چکے تھے، سرسیّد کو اور ان کے خاندان کو پہلے سے جانتے تھے، لندن میں اُن کا خاطر خواہ استقبال کرنے پہلے سے موجود تھے۔ ان میں نمایاں ترین لارڈ لارنس، سابق گورنر جنرل اور وائسرائے ہند تھے۔ جو سرسیّد کی بہت قدر کرتے تھے۔ انہوں نے سرسیّد کا تعارف لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں کروایا اور کئی اہم تقریبات میں سرسیّد کو مدعو کیا۔ لارڈ لارنس کے ہاں سرسیّد کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ خود بھی ہر پندرہ دن کے بعد باقاعدہ سرسیّد سے ملاقات کرنے ان کے مکان پر تشریف لایا کرتے۔ ان ہی کی وجہ سے سرسیّد کی ملاقات لارڈ اسٹینلے سے ہوئی، جو اس وقت ترکی میں انگلستان کے سفیر تھے۔ لارڈ اسٹینلے اور سرسیّد میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ قسطنطنیہ سے اکثر ان کا لندن آنا جانا رہتا تھا۔ جب بھی آتے سرسیّد سے ضرور ملتے۔ ایک اور اہم شخصیت مسٹر ایڈورڈ ٹامس کی تھی۔ جب سرسیّد دہلی میں منصف تھے اور آثار الصنادید کی تصنیف میں مصروف تھے تو ٹامس وہاں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ ٹامس انہی دنوں آثارُ الصنادید کا ایک نسخہ لندن لائے تھے اور لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں اس کتاب کو متعارف کروایا تھا۔ سوسائٹی کے ممبران اس تصنیف سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے سرسیّد کو غائبانہ سوسائٹی کا فیلو بنا لیا۔ چنانچہ ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے بھی اپنے فیلو سرسیّد احمد خان کی پذیرائی بڑی گرم جوشی سے کی۔ 23 جون 1869ء کو لارڈ لارنس نے سرسیّد کے اعزاز میں اپنے بنگلے پر ایک بہت بڑے ڈنر کا اہتمام کیا۔ جہاں ان کی ملاقات انگلستان کی بیشتر اہم شخصیات سے ہوئی۔ سول انجینئر وں کے سالانہ ڈنر میں بھی سرسیّد کو مدعو کیا گیا۔ ان کی سوسائٹی کے صدر نے اپنے خطبۂ صدارت میں سرسیّد کی موجودگی کا

بطور خاص ذکر کیا اور ان کی تعریف کی۔ سر سید نے ان کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے ایک مختصر تقریر کی، جس کا ذکر دوسرے دن اخبارات میں بھی ہوا۔

سر سیّد کی ملاقات ملکہ وکٹوریہ سے بھی ہوئی۔ ایک تقریب میں جہاں کئی مخصوص لوگوں کو ملکہ سے شرف ملاقات حاصل کرنے کی دعوت دی گئی تھی، سر سید کو بھی مدعو کیا گیا۔ ایک اور تقریب میں جو خاص سر سیّد کے اعزاز میں انڈیا آفس میں منعقد کی گئی، ڈیوک آف آرگائل نے سر سید کو سی ایس آئی (CSI) کا خطاب اور تمغہ عطا کیا۔ اے تھی نی اَم (Atheniam) کلب لندن نے بھی سر سیّد کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی اور انہیں اپنا اعزازی ممبر بنایا۔ یہ سینئر رائٹرز اور سکالرز کا کلب تھا۔ اس کی ممبر شپ بڑے اعزاز اور وقار کی بات سمجھی جاتی تھی۔ یہ تقریبات اور ملاقاتیں تو مخصوص مواقع پر مختصر اوقات کے لیئے وقوع پذیر ہوئیں مگر سر سیّد کا زیادہ وقت انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں، سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کے قابل اعتراض حصوں کا جواب لکھنے میں گزرا۔ یہ کتاب خطبات احمدیہ کے نام سے سر سیّد نے اُردو میں لکھی اور ساتھ ساتھ انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی کروایا۔ اس کی پہلی جلد بزبانِ انگریزی انگلستان میں اپنے قیام کے دوران چھپوائی۔ سر سیّد نے خطباتِ احمدیہ کی تصنیف میں محنت وایثار اور قربانی کے بے مثال جذبے سے کام لیا۔ انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم سے استفادے کے دوران سر سیّد احمد خان کے تاثرات پر مبنی ان کے سفرنامے سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

> ''کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا، ہوش جاتے رہے۔ کتب خانہ نہیں ہے کتابوں کا شہر ہے۔
>
> انڈیا آفس میں تمام ہندوستان کی قوموں کی تصویریں اور حالات و رسومات کی ایک کتاب (البم) ہے اور جس رسم کا اس میں بیان ہے اس کی بعینہٖ تصویر بھی ہے اور اکثر تصویریں فوٹو گراف کی لی ہوئی ہیں۔
>
> کتب خانہ برٹش میوزیم ایک نہایت بڑا جنگل کتابوں کا ہے کئی الماریاں صرف فہرست کی ہیں۔
>
> میں انڈیا آفس میں وزیرِ ہند کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب ''اسبابِ بغاوت'' مع تمام و کمال انگریزی ترجمے کے

دکھلائی۔ اُسے دیکھ کر بہت دل خوش ہوا...... میں نے انگریزی میں ان کی سب باتوں کا جواب دیا۔ سب سمجھا اور سب جواب صحیح دیئے مگر نہایت بد اور خراب انگریزی میں۔''[45]

سر سیّد نے اپنے قیامِ انگلستان کے دوران کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں کئی بار جا کر ان کے نظم و نسق اور نظامِ تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ساتھ ایک مترجم رکھا کرتے تھے۔ جو انگریزوں کے ساتھ ان کی گفتگو اور سوال و جواب کے وقت ان کی مدد کرتا تھا۔ سر سیّد نے وہاں کے کئی پبلک سکول بھی دیکھے اور ان کے بورڈنگ ہاؤسوں کا معائنہ کیا۔

ایک سال پانچ ماہ انگلستان میں قیام کرنے کے بعد آخر سر سیّد 2 اکتوبر 1870ء کو اپنے بیٹے سید حامد کے ہمراہ واپس بمبئی پہنچے۔ ان کے سفرِ انگلستان کے بارے میں نواب محسن الملک، حاجی اسماعیل خان کو لکھتے ہیں:

''سیّد احمد خان ولایت گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام اقوامِ روئے زمین پر شرف رکھتی ہے، انہی کے گھروں میں اور انہی کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس آ کر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشہ گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں، مگر یہ حامیٔ دینِ اسلام، کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطباتِ احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔''[46]

لندن کے اخبار ہوم میل میں سر سیّد کے قیامِ انگلستان سے متعلق 26 ستمبر 1870ء کو مندرجہ ذیل تاثرات شائع ہوئے:

''یہاں کے بہت سے مدبرانِ سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایک ایسے لائق اور واقف کار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سر سیّد احمد خان ہیں نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور پست (Poor) رہتی۔''[47]

خطبات احمدیہ

1868ء کے آغاز میں مولانا الطاف حسین حالی، نواب مصطفےٰ خان شیفتہ اور منشی امو جان، سر سید احمد خان کی دعوت پر سائنٹیفک سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیئے دہلی سے بنارس آئے۔ انہوں نے سر سیّد کے ہاں ہی قیام کیا۔ اس قیام کے دوران حالی کو سر سیّد سے بالمشافہ ملاقات اور ان سے گفتگو کے وافر مواقع ملے۔ حالی لکھتے ہیں کہ ان دنوں سر سیّد سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد ﷺ'' کا مطالعہ کر رہے تھے اور اس کے دِل آزار مندرجات پر سخت آزردہ تھے تھے۔ ولیم میور نے تعصب، مخالفت اور ناواقفیت کی بنا پر جو اعتراضات اسلام اور پیغمبرؐ اسلام پر کئے تھے اور جس منفی انداز میں آنحضور ﷺ کی سیرت کے بارے میں لکھا تھا، اس پر سر سیّد بڑے مضطرب تھے۔ وہ بار بار اس کا ذکر کرتے اور کہتے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو کچھ خبر نہیں۔ وہ ولیم میور کی کتاب کو مشنریوں کے مناظروں اور پروپیگنڈوں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ ولیم میور کا اندازِ تحریر بڑا عالمانہ اور محققانہ تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں بے شمار کتابوں کے حوالے اور ان کے اقتباسات دیئے تھے۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں سے اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں دلیلیں دی تھیں اور تاریخی معلومات اور جغرافیہ کی مدد سے کئی قرآنی بیانات کو غلط ٹھہرایا تھا۔ سر سیّد کہتے تھے اگر اس کتاب کا مفصل اور مدلل جواب لکھ کر حقیقتِ حال واضح نہ کی گئی تو نہ صرف اسلام دشمن قوتوں کو تقویت ملے گی بلکہ بہت سے نئی نسل کے مسلمان نوجوان بھی گمراہ ہو جائیں گے۔ وہ ولیم میور کا جواب دینا ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے اور اس کام کا آغاز کرنے کے لیئے بے قرار تھے۔ سر ولیم میور ہندوستان میں لیفٹیننٹ گورنر کے عہدے پر فائز تھا۔ سر سیّد کے دوست احباب اس کی کتاب کا رد لکھنے اور اس طرح اس کی ناراضگی مول لینے سے سر سیّد کو برابر منع کرتے رہے۔ مگر سر سیّد نے ان نصیحتوں کا مطلق کوئی خیال نہ کیا۔ وہ ولیم میور کی کتاب کا

جواب لکھنے پر کمر بستہ ہوگئے۔ مشکل یہ تھی کہ بہت سی کتابیں جس کا حوالہ ولیم میور نے اپنی تصنیف میں دیا تھا ہندوستان میں دستیاب نہ تھیں۔ اگر کچھ کتابیں کبھی موجود تھیں تو وہ اکثر و بیشتر 1857ء کے ہنگامے میں تلف ہوگئی تھیں۔ مغلیہ عہد کے اکثر کتُب خانے فسادات کی نذر ہو چکے تھے۔ پھر ولیم میور نے زیادہ تر جن کتب کا حوالہ دیا تھا وہ انگریزی میں تھیں۔ ولیم میور کے اعتراضات کا صحیح اور مفصل جواب دینے کے لیئے سر سیّد ان کتابوں تک رسائی حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ وہ اس مقصد کے لیئے انجیل اور توریت کی متعدد تفسیریں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ سب کتابیں لندن میں انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتُب خانوں میں پڑی تھیں۔ سر سید کے سفرِ انگلستان کا ایک بڑا مقصد ان کتُب خانوں سے استفادہ کرنا تھا۔

1869ء میں لندن پہنچتے ہی سر سیّد نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتُب خانوں سے استفادہ کرنے کے لیئے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کیا اور اپنی جیب سے تنخواہ دے کر ایک انگریزی دان معاون کی خدمات حاصل کیں، جو نہ صرف ان کے لیئے مطلوبہ انگریزی کتابوں کے مندرجات پر روشنی ڈالتا، بلکہ ان کے اقتباسات کا ترجمہ کر کے انہیں دیتا۔ سر سیّد کا منصوبہ یہ تھا کہ جو کچھ وہ ولیم میور کی کتاب کے جواب میں لکھیں، وہ انگریزی میں بھی شائع ہو، تاکہ اہلِ یورپ پر جو اثرات ولیم میور کی کتاب سے پڑ سکتے ہیں، زائل ہو جائیں۔ وہ جو کچھ لکھتے جاتے تھے، ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوتا جاتا۔ اس سلسلہ میں سر سیّد کو کس قدر محنتِ شاقہ سے کام لینا پڑا اور انہوں نے کس طرح اس کام میں دن کا چین اور رات کا آرام اپنے اُوپر حرام کیئے رکھا، اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے، جو اُس دوران اُنہوں نے لندن سے نواب محسن الملک سید مہدی علی خان کو لکھے۔ ان خطوط میں سے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ یہ اقتباسات حالی کی حیاتِ جاوید سے لیئے گئے ہیں۔

> ''میں روز و شب تحریرِ کتاب سیرِ مصطفوی (یعنی خطباتِ احمدیہ) میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔''

> ''میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں، سکتہ سا ہو گیا ہے، دِن رات کی تکلیف سے، جو میرا دِل ہی خوب جانتا ہے۔''

> ''لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ آنا

جانا، ملنا جلنا سب بند ہے۔ میں نے فرانس، جرمنی اور مصر سے کتب سیر منگوانی شروع کر دی ہیں۔ ایک آدمی مقرر کرلیا جو لیٹن (لاطینی) کا ترجمہ کر کے مضمون بتلا سکے۔''

اس قدر محنت اور دیدہ ریزی سے سرسیّد نے ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کے جواب میں جو کتاب تحریر کی اس کا نام خطباتِ احمدیہ رکھا۔ یہ کتاب کل 12 خطبات پر مشتمل ہے اور بارہ حصوں میں شائع ہوئی۔ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اس کی طباعت اور نشر و اشاعت کا مرحلہ کسی ہفت خواں کے طے کرنے سے کم نہ تھا۔ سرسیّد نے اپنا مکان گروی رکھ کر اور مزید دس ہزار روپے قرض لے کر سفرِ انگلستان کے اخراجات کا بندوبست کیا تھا۔ اب خطباتِ احمدیہ کی تصنیف اور اس کی طباعت کے اخراجات کا مزید بوجھ آن پڑا۔ سرسیّد کے خطوط سے چند مزید اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''خطباتِ احمدیہ کی جلد اوّل تمام ہوگئی ہے اور اس مہینے میں چھاپہ بھی تیار ہو جائے گا۔ اب جو اندازہ اس کی ایک جلد کے چھاپے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپے سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہے اور جان میں جان نہیں۔ میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے۔ تین سو روپے اس کے چندے کی بابت بھیجے ہیں۔ میر ظہور حسین صاحب نے ڈیڑھ سو روپیہ بھیجا ہے۔ مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے اپنا چندہ سو روپیہ کا بھیج دیا۔ آپ زین العابدین سے روپیہ منگوا کر بھجوا دیجئے۔ اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ کا بھی بھیج دیجئے۔''

''ان دنوں ذرا قدرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔''

''اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر، بھیگ مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمدؐ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔''

چندہ وصول ہونے میں تاخیر ہوتی ہے تو لکھتے ہیں ''کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف تک فروخت کر کے ہزار روپے بھیج دو۔''[48]

تحقیق و جستجو کے دوران سرسیّد کو اسلام کی حمایت میں اور حق و انصاف پر مبنی انگریزوں کی لکھی ہوئی دو نایاب کتابیں ملیں۔ ایک جان ڈیون پورٹ کی ''این اپالوجی فار محمدؐ اینڈ قرآن'' اور دوسری گاڈفری ہگنز کی کتاب جو پرانی کتابوں کی دُکان سے ان کے ہاتھ لگی۔ ان مصنفین کی حق گوئی سے ان کا دل بڑا خوش ہوا۔ انہوں نے ان کتابوں سے کئی حوالے خطباتِ احمدیہ میں دیئے۔ بازار میں یہ کتابیں نایاب تھیں۔ سرسیّد چاہتے تھے کہ یہ از سر نو طبع ہوں اور ان کی خوب نشر و اشاعت کی جائے۔ انگلستان میں ان کتابوں کی اشاعت کے علاوہ وہ ہندوستان میں انگریزوں اور مشنریوں میں یہ دونوں کتابیں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ لندن میں کئی ناشرانِ کتب سے انہوں نے بات کی، مگر کوئی کتب فروش اور پبلشر ان کتابوں کو چھاپنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر سرسیّد نے اپنے پلے سے خرچ کر کے ان کتابوں کو شائع کرایا اور وسیع پیمانے پر ان کی نشر و اشاعت کا بندوبست کیا۔ ہندوستان واپس آ کر اُردو میں ان کا ترجمہ بھی کروایا اور ان دونوں کتابوں کے اُردو ایڈیشن شائع کیے۔

سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' میں اکثر مقامات پر اگرچہ تعصب اور جانب داری سے کام لیا گیا تھا اور آنحضورﷺ کی سیرت پر بے بنیاد اعتراضات کئے گئے تھے، مگر ایک خوبی اس کتاب میں ضرور تھی کہ اس میں حوالے اور سند کے بغیر کوئی بات نہیں کی گئی تھی۔ یہ سارے حوالے مسلمانوں کی کتابوں میں سے لیئے گئے تھے۔ مگر سرسیّد اس کے اکثر حوالوں کو محلِ نظر سمجھتے تھے۔ خطباتِ احمدیہ میں انہوں نے انہی حوالوں کو غلط اور ناقابلِ اعتبار ثابت کیا ہے اور وضاحت سے یہ دکھایا ہے کہ جس بنیاد پر ولیم میور نے اپنی رائے قائم کی ہے وہ بنیاد ہی غلط ہے اور جن روایتوں پر انحصار کیا ہے وہ سرے سے قابلِ اعتبار ہی نہیں ہیں۔ تفسیر اور حدیث کی اکثر کتابوں کے متعلق سرسیّد نے خطباتِ احمدیہ میں لکھا:۔

> ''اپنی تصنیفات کا حجم بڑھانے کی نیت سے ہمارے مفسرین اور اہلِ سیر نے تمام مہمل اور بیہودہ افسانوں کو جو عوام الناس میں مشہور تھے باکمال آرزو جمع کر کے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے۔''[49]

> ''بعض نے اپنی تفسیروں میں واعظین کے لیئے دلچسپ، عجیب و غریب اور حمقاء کے خوش کرنے کے لیئے دُور از عقل و قیاس مضامین، جو یہودیوں کے ہاں مروج تھے، جمع کر دیئے ہیں۔''[50]

''اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت سی حدیثیں جناب پیغمبر خداﷺ کے نام سے جھوٹی اور موضوع بنائی گئیں۔''[51]

سر سیّد نے لکھا کہ ایک معتبر حدیث میں مندرجہ ذیل صفات ہونی چاہئیں:۔

1) راوی نے واضح طور پر غیر مبہم الفاظ میں بیان کیا ہو کہ خود پیغمبرؐ نے کیا کہا یا کیا۔

2) پیغمبرؐ تک راویوں کا تسلسل مکمل اور متواتر ہونا چاہیئے۔

3) پیغمبرؐ خدا سے آخری راوی تک ہر راوی خوف خدا اور اعمال صالح کے لیے مشہور ہو۔

4) ہر راوی کو اپنے پہلے راوی سے منتقل ہونے والی احادیث کی تعداد ایک سے زیادہ ہونی چاہیئے۔

5) ہر راوی میں علمی صلاحیت اور بطور خاص علم فقہ پر پوری قدرت ہونی چاہیئے۔

سر سیّد نے بیان کیا کہ ہر عہد کے علماء کا یہ متفقہ دعویٰ ہے کہ صرف قرآن پوری طرح متواتر ہے اور اس کے علاوہ وہ کچھ احادیث کو، تعداد میں صرف پانچ ...... متواتر کہتے ہیں۔ اسلام میں ہر مذہبی روایت کی قدر و قیمت کے تعین میں سب سے معتبر معیار قرآن ہے۔ اس لیئے کوئی حدیث جو قرآن کے خلاف ہو یا اس سے مطابقت نہ رکھتی ہو، اُسے غیر صائب کہہ کر رد کر دینا چاہیئے۔

سر سیّد نے راویوں کے علاوہ احادیث کے متن پر بھی توجہ دینے کی اہمیت واضح کی۔ انہوں نے خطبات میں لکھا کہ حدیث کے متن میں استعمال ہونے والے الفاظ اور اسلوب کا غور سے مطالعہ کیا جانا چاہیئے۔ ہر حدیث کے متن کا قرآن اور احادیث کی مذہبی تعلیمات، عقائد اور ادراک سے تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ حدیث کے بیان اور منشاء کی اس سوال کے پس منظر میں تنقیدی جانچ پڑتال ہو کہ کیا اس میں کوئی ایسا تاریخی واقعہ بیان ہوا ہے جو تاریخ کے نقطۂ نظر سے غلط ہے یا ایسے معجزات کا بیان ہوا ہے، جس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اور جسے عقل تسلیم نہیں کرتی۔ جن احادیث میں یہ چیزیں پائی جائیں وہ فرضی تصور کی جائیں۔ آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ دلائل و براہین سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پیغمبرؐ اشرف المخلوقات ہیں۔ ہمیں ایسی ہر روایت رد کر دینی چاہیئے جو اُن کی توقیر کے منافی ہو۔ یہ ایک مسلمہ تنقیدی اُصول ہے۔

مندرجہ بالا بنیادی اُصول اپنے سامنے رکھ کر سر سیّد نے ولیم میور کی ''لائف آف محمدؐ'' کے مندرجات

کے ایک ایک نکتے کا جائزہ لیا۔ ولیم میور نے خود قرآنِ حکیم کے بارے میں بڑی تفصیلی بحث کر کے تاریخی حوالوں اور مستند روایتوں سے یہ ثابت کیا تھا کہ قرآنِ حکیم ہو بہو وہی کتاب ہے جو آنحضور ﷺ نے اپنی زندگی میں مختلف کاتبانِ وحی سے لکھوائی۔ اس کتاب کا کوئی حرف آج تک تبدیل نہیں ہوا۔ قرآنِ حکیم کا جو نسخہ صدیوں سے دُنیا بھر کے مسلمان پڑھتے چلے آ رہے ہیں حرف بحرف وہی ہے جسے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم پر حضرت زید بن ثابتؓ نے جمع کیا اور جس کی نقول بعد میں حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں تیار کر کے تمام اسلامی ممالک کو بھجوائی گئی تھیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ولیم میور نے اس موضوع پر اس قدر عالمانہ بحث کی ہے اور اس طرح قطعی اور حتمی طور پر اس حقیقت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ مصر کے مشہور و معروف عالم جناب ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے اپنی بے مثل اور شہرۂ آفاق تصنیف حیاتِ محمدؐ میں، قرآنِ حکیم کے بارے میں ولیم میور کا یہ پُورا باب نقل کیا ہے۔ (مولانا محمد وارث کامل نے سیرۃ الرسولؐ کے نام سے محمد حسین ہیکل کی کتاب کا جو ترجمہ کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک غیر معمولی علمی کارنامہ ہے ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے)

قرآنِ حکیم کے بارے میں ولیم میور کے اس مؤقف پر سر سیّد نے بڑی خوشی کا اظہار کیا ہے چونکہ قرآنِ حکیم کے مامون و محفوظ رہنے کا ولیم میور خود قائل ہے، اس لیے سر سیّد نے قرآنِ حکیم کی آیات کو ہی اپنے اور اس کے درمیان کسوٹی قرار دیا ہے اور اسی پر ہر روایت اور ہر واقعے کو پرکھا ہے۔

خطباتِ احمدیہ میں خطبات کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:۔

پہلا خُطبہ عرب کی مفصل تاریخ اور اس کے جغرافیے کے باب میں ہے جس کی روشنی میں سر سیّد نے سر ولیم میور کے بعض اہم اور بنیادی اعتراضات کا جواب دیا ہے اور اس کی غلط بیانی اور ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے مثلاً مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ''فاران'' مکہ کے گرد و نواح میں ایک پہاڑی کا نام ہے جب کہ سر ولیم میور نے اُسے ملک شام میں بتایا ہے۔ اسی طرح ولیم میور کا مؤقف یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے بیٹے کبھی عرب میں آباد نہیں ہوئے، اس لیے حضرت محمدؐ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ سر سید نے ولیم میور کے اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا ہے۔

دوسرے خُطبے میں اہل عرب کے زمانۂ جاہلیت کے خیالات، عقائد اور رسم و رواج

بیان کئے ہیں اور اس زمانے کے شعراء کے بہت سے اشعار جسے جاہلیہ شاعری کہتے ہیں اپنے بیان کی وضاحت میں نقل کئے ہیں۔

تیسرا خطبہ اُن مذاہب اور اَدیان کے بارے میں ہے جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے۔ ولیم میور نے لکھا تھا اسلام محض پرانے مذاہب کے اُصولوں اور عقیدوں کا مجموعہ ہے۔ سرسیّد نے اس خطبے میں وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ''ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہوگی کہ یہ مشابہت اُصولِ اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اُصول سے، اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں جن کا مبداء ایک ہی غیر منتہی اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اُصول پر ہوں گی۔''[52]

چوتھا خطبہ اس حقیقت کے بیان میں ہے کہ اسلام عالمِ انسانیت کے لئے سراپا رحمت ہے اور عیسائیت اور یہودیت پر اسلام کے بڑے احسانات ہیں۔

پانچواں خطبہ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں، کتب حدیث، کتب سیر اور کتب فقہ کے بیان میں ہے۔

چھٹا خطبہ اسلام میں روایت کے موضوع پر قلمبند کیا ہے۔

ساتواں خطبہ قرآنِ مجید، اس کے نزول، سورتوں اور آیتوں کی ترتیب اس کی مختلف قرأتوں اور ناسخ ومنسوخ کی بحث پر ہے۔

آٹھواں خطبہ خانۂ کعبہ کے حالات اور اس کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات پر مشتمل ہے۔

نواں خطبہ حضرت محمد ﷺ کے نسب کی تحقیق پر ہے۔

دسواں خطبہ ان بشارتوں کے بارے میں ہے جو حضرت محمد ﷺ کے بارے میں توریت اور انجیل میں ہیں۔

گیارہواں خطبہ واقعہ معراج اور شقِ صدر کی حقیقت کی وضاحت میں ہے۔

بارہواں خطبہ حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے پہلے بارہ سال تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

سر سیّد نے توریت اور انجیل سے متعدد حوالے دے کر اور اپنے نقطۂ نظر کے حق میں کئی عیسائی مصنفوں کی کتابوں سے اُنکے اقوال نقل کر کے سر ولیم میور کے اعتراضات کا اتنا مکمل اور مفصل جواب دیا اور اس کے خلاف اتنے واضح اور نا قابلِ تردید ثبوت فراہم کیے کہ خود سر ولیم میور حیران رہ گیا۔ اس کے پاس سر سیّد کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے کہا ''میں نے سر سیّد احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کئے، میں نے تو اس اسلام پر اعتراض کئے ہیں، جس کو تمام دُنیا کے مسلمان مانتے چلے آئے ہیں۔'' حاؔلی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''یہ بعینہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیر انداز کسی گروہ کو نہتا سمجھ کر اس پر تیر برسانے شروع کر دے اور جب اُدھر سے بھی خلاف توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ تو نہتوں سے ہے تیر اندازوں سے نہیں ہے۔''[53]

ریورنڈ ہوپر نے جو لاہور ڈی وِنی ٹی (Divinity) کالج کے پرنسپل تھے، خطباتِ احمدیہ پڑھنے کے بعد حاؔلی سے کہا ''مسلمانوں پر نہایت تعجب ہے کہ وہ سر سیّد احمد خان کو کافر ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو کام سر سیّد احمد خان نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے، وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا۔ جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں، تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے ان پر اسلام کی حقیقت اور خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جا کر انہی کی زبان میں وعظ کہتے یا ان کی زبان میں اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھتے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سر سیّد احمد خان سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔''[54]

اقباؔل کے استاد اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر آرنلڈ کے الفاظ میں ''ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت میں کوئی کتاب لکھی اور اس کا ترجمہ کسی یورپین زبان میں ہو گیا۔ لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ میں جا کر یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون کی کوئی کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔''[55]

لندن کے ایک انگریزی اخبار میں کسی انگریز نے اپنے خط میں لکھا:۔

> ''عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے اُنہی کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اُس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان

تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے، جو عیسائی اس کے خوش نما چہرے پر لگاتے ہیں۔''[56]

سرسیّد کے سب سے پہلے سوانح نگار کرنل گراہم نے اپنی کتاب لائف اینڈ ورک آف سرسیّداحمد خان میں خطباتِ احمدیہ کے بارے میں لکھا ہے'' جولوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو چاہیئے کہ اس کتاب کوغور سے پڑھیں۔ دینِ محمدیؐ فی زمانہ انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے۔ وہ اُسے ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں، جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بوناپارٹ (نپولین) کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ اسلام عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب اور تنگ دلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے، لیکن ہمارے قارئین جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سرسیّد احمد خان کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ سرسیّد احمد خان نے اپنے دوست سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ '' کے مندرجات کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ بے تعصب اور نکتہ سنج قارئین بہت سی باتوں میں ولیم میور کے خلاف فیصلہ دیں گے۔''[57]

تہذیب الاخلاق

سرسید اپنے قیامِ لندن کے دوران رات دن اس فکر میں رہے کہ اپنے ہم وطن مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کس طرح دُور کی جائے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیاں دیکھنے کے بعد ان کے دل میں ایک اعلیٰ درجہ کی مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ مگر اتنے عظیم منصوبے کو کیونکر ممکن العمل بنایا جائے، مسلمانوں میں اہلِ ثروت طبقے کو کس طرح اس منصوبے کی افادیت کا قائل کیا جائے، انہیں اس منصوبے کے لیئے دل کھول کر چندہ دینے پر کس طرح آمادہ کیا جائے، مسلمانوں کے دِلوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے کی آرزو کس طرح پیدا کی جائے، ان کو پستی سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر کس طرح گامزن کیا جائے؟

یہی وہ خیالات اور سوچیں تھیں جو سرسیّد احمد خان کو گھیرے رہتی تھیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لیئے اور اس سے متعلقہ موضوعات پر متعدد مضامین لکھے، جو وہ لندن سے علی گڑھ گزٹ کے لیئے بھیجتے رہتے تھے۔ مختلف حیلوں بہانوں اور طریقوں سے عامۃ المسلمین کی توجہ اس اَمر کی جانب مبذول کراتے رہتے تھے کہ جو جہالت اور اوہام پرستی انہیں انگریزی تعلیم سے باز رکھے ہوئے ہے، وہ ان کے مستقبل کے لیئے زہرِ قاتل سے کم نہیں۔ مسلمان اپنی ذہنی پستی اور جہالت میں یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے اور انگریزوں کی ملازمت سے ان کے دِین کو خطرہ لاحق ہے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ اسلام دُنیاوی ترقی کے حق میں نہیں۔ جب کہ سرسیّد کا مقولہ یہ تھا کہ دِین چھوڑنے سے دُنیا نہیں جاتی، مگر دُنیا چھوڑنے سے دین بھی جاتا ہے۔ عام مسلمانوں کے علم دشمن اور قدامت پرستانہ رویے کی بنیاد پر عیسائی یہ الزام لگاتے نہیں تھکتے تھے کہ اسلام ترقی اور تمدن کا دشمن ہے۔ اس صورتِ حال کے تدارک کے لیئے اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کی ترغیب دینے اور ان میں ترقی کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے سرسیّد نے ہندوستان واپس پہنچتے ہی دو کام کیئے۔ ایک تو انہوں نے ایک رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے نکالا۔ اس کی پیشانی پر انگریزی میں لکھا تھا ''محمڈن سوشل ریفارمر۔'' وہ

اس کے سرِ ورق کا ڈیزائن لندن سے ہی بنوا کر لے آئے تھے۔ اس میں انہوں نے زیادہ تر مذہبی، سیاسی، تعلیمی، سماجی اور اخلاقی نوعیت کے مضامین شائع کئے، تاکہ مسلمان ان تمام بُری رسموں کو ترک کرنے پر آمادہ ہوں جو دینِ اسلام کے خلاف اور تہذیب وشائستگی کے منافی ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو اَن پڑھ مولویوں کے غلط نظریات سے آگاہ کیا اور مسلمان فقہا کی مستند کتابوں کے حوالے دے کر واضح کیا کہ جو غلط نظریات اور رسم ورواج مسلمانوں میں راہ پا گئے ہیں اور اب ان کے اعتقادات بلکہ ایمان کا حصہ بن چکے ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ اسلام کی اصل رُوح کے منافی ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں مدتوں سے بیٹھے ہوئے تصورات پر جو زد پڑی تو ہر طرف سے تہذیب الاخلاق کی مخالفت شروع ہوگئی۔ صرف کانپور سے دو رسالے نور الآفاق اور نور الانوار اسکے توڑ میں نکالے گئے۔ اہلِ حدیث کا مشہور رسالہ اشاعۃ السنہ بھی سرسید اور ان کے رسالے کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا مگر سرسید نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اور ان کے ساتھی سید مہدی علی خان اور مولوی چراغ علی برابر ان موضوعات پر مضامین لکھتے چلے گئے۔ یہ رسالہ چھ سال تک باقاعدگی سے نکلتا رہا جتنی اس کی مخالفت بڑھی اتنی ہی اس کی اشاعت بڑھی چھ سال میں 112 مضامین صرف سرسیّد کے قلم سے نکلے۔ سرسیّد کی تحریر بڑی دل نشین ہوتی تھی۔ لوگوں کی رائے رفتہ رفتہ ان کے مؤقف کے حق میں ہوتی گئی۔ حالؔی لکھتے ہیں:- سرسیّد کی تحریر کی نسبت یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ اس کے دیکھنے کے بعد آدمی اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ملک کے طول وعرض میں ایک اچھا خاصا طبقہ سرسیّد کے خیالات کا حامل بن گیا۔ جن موضوعات پر عام مسلمانوں میں سوچنے کی ہمت یا کوئی آرزو ہی نہ تھی، سرسیّد نے اپنے رسالے کی مدد سے ان موضوعات کو ہر جگہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ ہر محفل میں سرسیّد کے اٹھائے ہوئے سوالات زیرِ بحث آنے لگے۔ خیالات کا جمود ٹوٹا، ذہن نئی روشنی سے آشنا ہوئے۔ سوچ میں تبدیلی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس طرح سرسیّد نے اپنے عظیم تعلیمی منصوبے کی عالی شان عمارت کے لیئے زمین ہموار کی اور لوگوں کو اس جانب مائل کیا کہ وہ سرسیّد کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے ان کی مدد کو آگے بڑھیں۔

علی گڑھ تحریک کا آغاز

دُوسرا کام جو سر سیّد نے لندن سے بنارس واپس پہنچتے ہی کیا وہ یہ تھا کہ ''تدابیر فی ترقیِ تعلیمِ مسلمانان'' کے عنوان سے ایک اشتہار اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہر طرف مشتہر کر دیا۔ علی گڑھ اخبار میں بھی شائع کیا اور حکومت کے دفتروں، بلدیاتی اداروں اور تمام سکولوں کالجوں میں بھی تقسیم کیا۔ اس اشتہار میں یہ سوالات اٹھائے گئے تھے کہ سرکاری کالجوں اور سکولوں میں مسلمان طالب علم کن وجوہات کی بنا پر بہت کم داخلہ لیتے ہیں؟ قدیم علوم جن میں کبھی مسلمانوں نے ترقی اور پیش رفت کی نئی راہیں کھولی تھیں اب ان میں کیوں ناپید ہو گئے ہیں اور جدید علوم ان میں رواج کیوں نہیں پا رہے؟ ان کے اسباب دریافت کرنے خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیئے۔ انہوں نے ہر پڑھے لکھے ذی شعور مسلمان کو اس موضوع پر مضمون لکھنے کی دعوت دی۔ اس مقصد کے لیئے ایک کمیٹی بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ جو مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی کے اسباب و علل پر مضامین لکھوائے اور اعلان کیا کہ ان مضامین پر انعامات دیئے جائیں گے اوّل انعام پانچ سو روپے دوسرا انعام تین سو روپے اور تیسرا انعام ڈیڑھ سو روپے مقرر کیا گیا۔ یہ اَمر قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے میں یہ رقوم بڑی کثیر تھیں اس کے لیئے چندہ اکٹھا کرنے کی تحریک بھی شروع کی اور اعلان کیا کہ زیادہ چندہ دینے والوں کو مجوزہ کمیٹی کا ممبر بنایا جائے گا۔

سر سیّد کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح ایک تو مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے کو اس موضوع پر سوچنے اور غور و فکر کرنے کی تحریک ہوگی۔ دوسرے اس طرح جو مختلف تجاویز سامنے آئیں گی ان کا جائزہ لیا جائے اور کسی موزوں راہِ عمل کا تعیّن کیا جائے۔ وہ قرآنِ حکیم کے اس حکم پر عمل کر رہے تھے کہ اپنے امور باہمی مشورے سے طے کرو۔ اس طرح وہ لوگوں میں رضا کارانہ تعاون کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

سر سیّد کے اشتہار کے جواب میں چندہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ دسمبر 1870ء میں اشتہار نکلا تھا، چند دنوں کے اندر ہی ایک ہزار روپے سے زیادہ چندہ جمع ہو گیا۔ (خیال رہے کہ موجودہ زمانے میں یہ رقم ایک لاکھ روپے سے بھی کہیں زیادہ ہو گی) نواب کلب علی خان رئیس رام پور، کنور وزیر علی رئیس بلند شہر، سر ولیم میور مصنف ''لائف آف محمدؐ''، ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانانِ ہندوستان'' کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کا پہلا اجلاس 26 دسمبر 1870ء کو بمقام بنارس منعقد ہونا طے پایا۔ یہاں نواب محسن الملک کی تحریر سے مندرجہ ذیل اقتباس دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:۔

> ''جس تاریخ، کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لیئے جلسہ قرار پایا تھا اس سے ایک روز پہلے میں بنارس پہنچ گیا تھا۔ رات کو سر سیّد نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سر سیّد کو ان کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں ان کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔''[58]

اس کمیٹی کی کوششوں اور اس موضوع پر تمام مضامین اور تجاویز کے جائزے کے بعد یہ طے پایا کہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ اور نئے علوم و فنون کی روشنی سے انہیں بہرہ ور کرنے کے لیئے ایک اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جائے۔ اس کے لیئے نہ صرف مسلمان خود چندہ دیں بلکہ گورنمنٹ بھی امداد بہم پہنچائے۔ مفصل تجویز گورنر جنرل کو بھیجی گئی، جس نے اس تجویز پر مسرت کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں سر سیّد احمد خان اور دوسرے سربرآوردہ مسلمان روٴسا کی کوششوں کو سراہا اور حکومت کی طرف سے ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد سر سیّد نے اس مضمون کا ایک اشتہار دیا کہ مسلمانانِ ہند یہ بتائیں کہ مدرسۃ العلوم (اینگلو اورینٹل کالج) کس شہر میں قائم کیا جائے۔ زیادہ رائیں اس حق میں آئیں کہ مدرسہ علی گڑھ میں قائم ہو۔ ایک ذیلی کمیٹی چندہ وصول کرنے اور آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب رکھنے کے لیئے

بنائی گئی۔ سرسیّد کو اس کمیٹی کا لائف سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ آغازِ کار ہی میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے مدرسۃ العلوم میں مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کے شعبے کے لیے دس ہزار روپیہ کا عطیہ اپنی جیب سے دیا۔ سرولیم میور نے ایک ہزار روپیہ اور مسٹر اسپنسکی جج ہائی کورٹ الٰہ آباد نے ایک معقول رقم بطور چندہ دی۔ کمیٹی رجسٹرڈ کرائی گئی، تا کہ کمیٹی کے نام چندہ جمع کرایا جا سکے۔ اس اثناء میں کانپور سے مولوی امداد علی نے، جو اس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے یہ فتویٰ شائع کیا کہ جو لوگ مدرسۃ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں۔ کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ مدرسہ میں سرسیّد احمد خان کا بت رکھا جائے گا۔ کسی نے کہا وہاں نیچریوں کے عقائد کے موافق تعلیم دی جائے گی۔ طلبہ کو انگریزی لباس پہننا پڑے گا اور انہیں گردن مروڑی مرغی کھانا پڑے گی۔ مخالفت میں اس طرح کی آوازیں اُٹھتی رہیں مگر سرسیّد احمد کے پائے استقلال میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ انہوں نے اپنی کوششوں میں دن رات ایک کر دیا۔ اپنے دوستوں اور معاونوں سے کہا کہ قریہ قریہ، بستی بستی اور شہر شہر پھیل جائیں اور مدرسہ کے قیام کے لئے رقم اکٹھی کریں۔ گھر گھر جا کر لوگوں کو اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی اشد ضرورت کا احساس دلائیں اور مخالف آوازوں پر کان نہ دھریں۔ انہوں نے خود مخالفوں کے تمام اعتراضات کا مفصل اور مسکت جواب ایک مضمون میں دیا، جو تہذیب الاخلاق میں چھپا۔ انہوں نے دوسرے اخبارات کے ایڈیٹروں سے بھی درخواست کی کہ اس مضمون کو شائع کریں۔ اس مضمون کے آخری فقرے جن سے سرسیّد کا عزمِ صمیم ٹپکتا ہے ملاحظہ ہوں:-

> ''اگر خدا کی مرضی ہے تو ہم سب کچھ کریں گے۔ اگر زندہ ہیں اور خدا کو بھی منظور ہے تو اپنے مخالفوں کو دکھا دیں گے کہ خدا نے کیا کیا اور اگر اس میں آنکھ بند ہو گئی اور لحد میں جا سوئے تو یہ امید رکھیں گے کہ ''مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند۔''[59]

24 مئی 1875ء کو ابتدائی مدرسۃ العلوم کا افتتاح ہو گیا۔ سرسیّد احمد خان وسط 1876ء میں ملازمت سے ریٹائرمنٹ کی درخواست دے کر اور پنشن منظور کروا کے علی گڑھ میں آ گئے۔ یہاں پہنچ کر سرسیّد نے اپنی نگرانی میں مدرسہ کی عظیم الشان عمارت کی تعمیر کے آغاز کی تیاریاں شروع کر دیں اور اس سلسلے میں ضروری کارروائیاں مکمل کیں۔ آخر 8 جنوری 1877ء کو لارڈ لٹن وائسرائے ہند کے ہاتھوں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل (M.A.O) کالج کا سنگِ بنیاد جن حالات میں رکھا گیا اُن کی ایک جھلک سر سیّد کے جگری دوست مولوی سمیع اللہ خان کی زبانی دیکھئے ''میں اور سر سیّد تہجد کے وقت اُٹھ کر میدانِ تعمیر میں آگئے ، سہانا اور رُوح پرور وقت ، فضا میں خاموشی ، طبیعتوں میں قومی ہمدردی اور دینی حمیت جوش زن ، ایک عجیب کیفیت طاری تھی جو سرور انگیز بھی تھی رقت خیز بھی اور عبرت آموز بھی ، مغلیہ سلطنت کے بعد ارضِ ہند پر ملتِ اسلامیہ کی یہ پہلی بنائے تعمیر تھی اور زندگی اور ترقی کے خواب کی پہلی تعبیر ، اس وقت جوشِ طبیعت میں گریہ طاری ہو گیا ، ہم دونوں روتے جاتے تھے ، ربِ ذوالجلال کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جاتے تھے اور اس کے فضل و بخشش کے لیئے ہمارے لبوں پر دُعا تھی۔''[59 ب]

سر سیّد کے ذہن میں اس منصوبے کی وُسعت اور رفعت کا کیا خاکہ تھا اور بظاہر یہ کس قدر ناممکن منصوبہ تھا ، اس کا اندازہ سر سیّد کے ان الفاظ سے ہوتا ہے :-

> ''جب میں نے اپنے دوستوں سے ایسا ارادہ (چندہ جمع کرنے کے بارے میں) ظاہر کیا تو انہوں نے روپیہ کی تعداد پوچھی جو اس کے واسطے ضروری تھی ۔ میں نے ایک معتدل تعداد پندرہ لاکھ روپیہ (یعنی آج کل کے تقریباً پندرہ کروڑ روپے) بیان کی ، جو حقیقت میں اتنے بڑے کام کے لیئے کافی نہ تھی ۔ اس تعداد کو سن کر میرے دوست جو میری رائے کو پسند بھی کرتے تھے ، متعجب ہوئے ان کے منہ سے یہ آواز نکلی کہ پندرہ لاکھ روپیہ اور ہندوستان ! کیا کچھ جنون ہو گیا ہے ...... اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کو ناممکن تصور نہ کرتا ہو اور جب کہ چندہ جمع کرنے کا ذکر ہوا تو جو نہایت خاص احباب تھے وہ بھی زیرِ لب مسکراتے تھے اور اس خیال کو جنون اور دیوانہ پن تصور کرتے تھے۔''[60]

سر سید بتاتے ہیں کہ چندہ کمیٹی (خزینۃ البضاعۃ) بننے کے بعد جو پہلی رقم کمیٹی کی تھیلی میں پڑی وہ ایک روپیہ دو پیسے تھی ۔ سبحان اللہ یہ آغاز تھا ان عظیم الشان عمارات کے لیئے لاکھوں روپیہ جمع کرنے کا جن کو اگر کوئی آج دیکھے تو عقل دنگ اور زبان گُنگ رہ جاتی ہے ۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ ہزاروں میل کا سفر بھی ایک قدم سے ہی شروع ہوتا ہے ۔ صرف ارادے کی پختگی اور ہمت کی فراوانی شرط ہے ۔

یہاں حالی نے ایک قابلِ ذکر واقعہ بیان کیا ہے ۔ سید محمود ان ہی دنوں جب مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے لیئے چندے کی مہم زور و شور سے جاری تھی دوبارہ انگلستان گئے اور کیمبرج میں اپنے دوستوں اور اساتذہ

سے ملے۔ انہیں پتہ چلا کہ کیمبرج یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے اور وہاں کے اربابِ اختیار اس سرمائے کو خرچ کرنے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ ایک تدبیر اُن کے ذہن میں یہ آئی کہ ٹرینٹی کالج کے ساتھ جو پرانا لیکن نہایت پختہ اور خوبصورت چرچ ہے اُسے گرا کر دس لاکھ کی لاگت سے ایک نئی عظیم الشان عمارت تعمیر کی جائے۔ سید محمود نے وہاں اپنے دوستوں سے کہا کہ اس پرانی شاندار عمارت کو گرانے اور اس کی جگہ نئی عمارت کھڑی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اتنا وافر ہے تو مدرستہ العلوم علی گڑھ چار پانچ لاکھ روپے کی امداد دے دی جائے۔ اس پر ان کے ایک انگریز دوست نے سوال کیا کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان ہیں؟ سید محمود نے بتایا ''تقریباً چھ کروڑ کے قریب ہیں۔'' وہ سن کر حیران ہوا اور کہنے لگا ''جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہیں کہ چھ کروڑ آدمی اولاد کی تعلیم کے لیئے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے، ان کی اعانت کرنی گناہ ہے ان کو تباہ ہونے دو۔''[61]

سرسید نے چندہ اکٹھا کرنے کے لیئے ہندوستان بھر میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں سب کمیٹیاں بنائیں اور اپنے رضا کاروں اور کارکنوں میں ایسا قومی جذبہ بھر دیا کہ ایک زبردست ملک گیر مہم شروع ہو گئی۔ چندے کے لیئے کام کرنے والوں نے دِن رات ایک کر دیا۔ اس کا ہر ممکن جتن کیا۔ سرسیّد کے اپنے الفاظ میں ''ہم نے دستِ گدا گری ہر امیر غریب کے سامنے دراز کیا اور اس عار کو اپنے اُوپر گوارا کیا...... ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قیامت کا عذاب اپنی گردن پر لیا۔ کالج کی تکمیل کے لیئے، نہیں، قومی ترقی کا سامان مہیا کرنے کے لیئے لاٹری ڈالی۔ جواء کھیلا۔ اس پر بھی بس نہیں کیا...... سوانگ بھر کر اسٹیج پر کھڑے ہوئے دوستوں نے فقیروں کا بھیس بدلا۔ بدو بن کر اور مینڈھا بغل میں داب کر، خدا کے لیئے مانگا۔''[62]

باپ دادا مغل بادشاہوں کے ہاتھوں سے خِلعت پانے والے، صاحبانِ جاہ و حشم کا چشم و چراغ، سرداروں کا سردار، سیّدزادہ، قوم کی خاطر بھِک منگا بن گیا۔ قوم کے عشق نے گلی گلی نچایا۔

ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ سخت مخالفت ہوئی۔ سیّد نے کہا ہم اپنی ذات کے لیئے جہاں اتنے ہزاروں غیر اسلامی کام کرتے ہیں وہاں قوم کے لیئے ایک یہ ناجائز کام بھی سہی۔ لاٹری کا گناہ رئیسوں اور دولت مندوں پر ہوگا۔ اگر وہ کالج کی مدد کرتے جتنی کہ ضرورت تھی تو ہم لاٹری کیوں ڈالتے؟

ہم نے ایک دوست سے کہا ''بھائی! ہماری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا۔'' دوسرے نے بدمزہ ہو کر کہا ''صاحب، ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے۔'' میں نے کہا ''ارے میاں! اب کچھ دن میں ہم

مر جائیں گے۔ پھر کون تم سے چندہ مانگے گا۔"

خود اسٹیج پر کھڑے ہو کر حافظ کی غزلیں گائیں، نمائش میں کتابوں کی دکان لگائی۔ کتابیں بیچنے کاؤنٹر پر خود کھڑے ہو گئے۔ ایک بی بی برقعہ اوڑھے آئی۔ کچھ کتابیں خریدیں۔ کہنے لگی" آپ تو بہت بڑے سادات خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ کسی اور کو اس کام پر لگایا ہوتا۔" سید بولے" بی بی! ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ ہم کوئی سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔"

بی بی بولیں" سیّد! تُو تو دو جہاں کا بادشاہ ہے، آپ سوالی کیونکر ہونے لگے۔ سوالی تو ہم ہیں۔ آپ نے پہچانا نہیں۔ میں آپ کی پرانی کنیز ہوں ناز و جان۔"

ناز و جان نے ایک دن سیّد احمد کو بلا بھیجا۔ وہ اپنے دوست سیّد زین العابدین خان کے ہمراہ اس کے ہاں گئے۔ اس نے کہا" سیّد صاحب یہ حویلی میں نے فروخت کر دی ہے یہ مہاجن بیٹھے ہیں۔ ہر دیال جی، انہوں نے خرید لی ہے۔ پھر ہر دیال جی سے مخاطب ہو کر کہا" ہر دیال جی! آپ اپنے ہاتھ سے 35 ہزار روپے کی رقم مدرسے کے لیئے سیّد صاحب کو دے دیجئے گا۔" سیّد صاحب یہ آپ کے قدموں میں میرا ادنیٰ سا ہدیہ ہے تا کہ اگلے جہان میری بخشش ہو جائے۔ بس ایک التجا ہے میرے جنازے پر ضرور تشریف لایئے گا۔

کچھ عرصے بعد جب ناز و جان کا انتقال ہوا تو سر سیّد احمد اس کے جنازے پر مولانا الطاف حسین حالؔی، شمس العلماء شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلماء سیّد ممتاز علی اور محسن الملک سیّد مہدی علی خان کو بھی اپنے ساتھ لے کر گئے۔

ملک کے طول و عرض سے چندہ وصول کرنے کی جس عوامی مہم کا بیڑہ سر سیّد نے اٹھایا تھا اس کی کوئی نظیر پہلے نہ تھی۔ کسی مذہبی کام کے لیئے تو شاید پھر بھی اس قسم کی کوئی تحریک ممکن سمجھی جاتی، مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے فروغ کے لیئے بڑے پیمانے پر ایک عظیم الشان مدرسے کا قیام تو اس وقت عام مسلمانوں کی سوچ کے ہی خلاف تھا۔ مغربی علوم و فنون کو دین و مذہب کا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے نئی روشنی اور نئی سوچ پر مبنی مضامین کی وجہ سے سر سیّد کو اہلِ مذہب پہلے ہی ملحد، مرتد، کافر، کرسٹان اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ جب اس تمام صورتِ حال کا خیال کیا جائے تو جو کام سر سیّد نے بالآخر کر دکھایا وہ کس قدر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہر بڑے آدمی کی طرح سر سیّد نے

مخالفتوں اور رکاوٹوں کی کوئی پرواہ نہ کی۔ ایک دفعہ جب انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ کام کرنا ہے تو پھر مشکلات اور دشواریوں بلکہ ناممکنات کے کوہِ گراں کو بھی وہ خاطر میں نہ لائے۔ وہ جس عزم و ہمت اور استقلال سے اپنی منزل کی طرف بڑھے اس کی ہیبت اور جلال سے لرزہ براندام ہو کر راستے کے پتھر خود ہی لڑھک کر ہٹتے چلے گئے۔

مسلمانوں کو زیاں کا احساس دلانے اور ان کے دلوں میں زوال کی اتھاہ پستیوں سے نکلنے کی امنگ پیدا کرنے کے لیئے مولانا الطاف حسین حالؔی نے سرسیّد کے ایما پر اُردو کی مقبول ترین طویل نظم مسدسِ حالؔی لکھی۔ اس نظم نے مسلمانوں کے اجتماعی ملی شعور کو بیدار کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ سرسیّد مسدسِ حالؔی کی تخلیق پر نازاں تھے وہ کہا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تم نے دُنیا میں کیا کارنامہ سرانجام دیا تو میں کہوں گا کہ میں نے الطاف حسین حالؔی سے مسدسِ حالؔی لکھوائی ہے۔

مدرسۃ العلوم کے لیئے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم کو سرسیّد نے عملی طور پر کس جانفشانی اور تدبر سے چلایا اور اس کوشش میں کیا کیا جتن کیے، کس دانش مندی اور فراست سے لوگوں کی جیبوں سے پیسے نکلوائے اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوتا ہے۔

> ''ایک بار سرسیّد نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا، چندہ طلب کیا اس نے بہت رُوکھے پن سے جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لیئے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیئے۔'' سرسیّد نے کہا'' بے شک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر یہ انسٹیٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہو گیا تو انگریزوں کے لیئے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہو گی کہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے۔'' وہ انگریز یہ سن کر شرمندہ ہوا اور اُسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سرسیّد کو نذر کیا۔''[63]

سرسیّد چندہ اکٹھا کرنے کی مہم کے سلسلے میں اکثر سفر میں رہتے اور سفر کے تمام اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے۔ سرسیّد کے دوست احباب کا بھی یہی حال تھا۔ جو خرچہ چندہ جمع کرنے پر اُٹھتا وہ خود

برداشت کرتے۔ سرسیّد جہاں جاتے کئی لوگ انہیں اپنے ہاں مہمان رکھنا چاہتے مگر ہمیشہ ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلے میں قیام کرتے، البتہ جو لوگ انہیں کھانے کی دعوت دیتے انہیں کہتے جو خرچ آپ نے میری دعوت پر کرنا ہے مجھے نقد دے دیں۔ اس طرح اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی چھوڑتے۔ ایک دفعہ ان کے ایک عقیدت مند نے دعوت کا خرچہ نقد ادا کرنے کے مطالبے پر ان کو ایک روپیہ پیش کیا سرسیّد کہتے ہیں:-

''میں نہایت خوش ہوں کہ مدرسۃ العلوم کے آٹھ دس مزدوروں کی مزدوری ملی۔''

سرسیّد نے اپنے بیٹے سیّد محمود کی شادی کی۔ ولیمے کا اہتمام نہ کیا جب دوست احباب نے تقاضا کیا تو کہنے لگے ہم ولیمہ جس قدر شان وشوکت اور تزک واحتشام سے بھی کریں اس پر پانچ سو روپے سے زیادہ خرچ نہیں اُٹھے گا۔ میں نے سیّد محمود کے ولیمے کے پانچ سو روپے مدرسۃ العلوم کے فنڈ میں ڈال دیئے ہیں۔ اسی طرح جب سرسیّد نے اپنے پوتے کی بسم اللہ کی رسم پر تقریب کا اہتمام کیا تو مہمانوں کی خاطر تواضع پر مطلق کچھ خرچ نہ کیا ان سے پوتے کی درازی عمر اور مدرسۃ العلوم کی ترقی کے لیئے دُعا کروائی اور یہ اعلان کیا کہ اس تقریب میں مہمانوں کی خاطر تواضع پر جتنے پیسوں کے خرچ کا تخمینہ تھا اتنے پیسے میں مدرسہ کے فنڈ میں دے رہا ہوں۔ حالی لکھتے ہیں کہ اس موقع پر سرسیّد نے اپنی جیب سے پانچ سو روپے چندے میں دیئے۔

لوگوں کو چندہ دینے پر راغب کرنے کے لیئے سرسیّد نت نئی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے بارے میں انہوں نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص ایک کمرہ بنوائے گا کمرے پر اس کے نام کی تختی نصب کی جائے گی۔ اس طرح اہلِ ثروت مسلمانوں میں ہوسٹل کے کمرے بنانے کے لیئے چندہ دینے کی تحریک ہوئی۔ کالج کے احاطے کی ہر جالی پر جالی لگوانے والے کا نام درج کیا گیا۔ حالی لکھتے ہیں کہ ایک یورپین افسر نے کہا تھا ''یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے۔''[64]

سرسیّد نے اپنے ہندو دوستوں اور احباب سے بھی چندے کی پُر زور اپیل کی۔ بعض ہندو رئیسوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ اس سلسلے میں جناب سردار دیال سنگھ بہادر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مدرسے کی دیواروں اور محرابوں پر کئی ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جو ان کی فیاضی اور فراخ دلی یا سرسیّد کے حُسنِ طلب

کی یاد دلاتے ہیں۔

سرسیّد نے چندے کے لئے انگلستان میں اپنے تمام جاننے والوں اور دوست احباب کو خط لکھے۔ بعض مخیّر اور نیک دل انگریزوں نے وہاں سے چندہ بھیجا۔ ان میں سرسیّد احمد خان کے دوست لارڈ اسٹینلے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے انگریزوں نے مدرسۃ العلوم کے لئے بڑی فیاضی سے پیسے دیئے۔ ان میں وائسرائے ہند لارڈ لٹن سے لے کر ادنیٰ اہلکاروں تک کئی لوگ شامل ہیں۔ سر ولیم میور نے جس کی کتاب لائف آف محمد کا جواب سر سید احمد خان نے خطباتِ احمدیہ کی صورت میں شائع کیا تھا، خود علی گڑھ آ کر اپنی جیب سے ایک خطیر رقم مدرسہ کے لئے دی اور اپنے خطاب میں سرسیّد کی کوششوں اور ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ لیفٹیننٹ گورنر سرجان اسٹریچی کا تو مدرسہ پر سب سے زیادہ احسان ہے۔ جس وسیع قطعۂ زمین پر مدرسۃ العلوم تعمیر ہوا وہ رقبہ سرجان اسٹریچی کی کوششوں سے ہی ملا۔ علی گڑھ کی مقامی انتظامیہ نے جس میں علی گڑھ کا ڈپٹی کمشنر بھی شامل تھا، زمین کی گرانٹ کی سخت مخالفت کی مگر سرجان اسٹریچی کی مداخلت سے مخالفت دب کر رہ گئی۔

مدرسۃ العلوم (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) علی گڑھ کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم کا آغاز 1871ء میں ہوا۔ سرسیّد جب تک زندہ رہے اس مہم میں نہ صرف انہوں نے بڑی جاں فشانی سے حصہ لیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی اکلوتے اس مہم کے لیڈر اور رُوحِ رَواں تھے۔ یہ مہم 1898ء میں ان کی وفات کے بعد بھی بڑے زور و شور سے جاری رہی۔ جس کام کا آغاز بارش کے پہلے قطرے کی طرح پانی کی ایک ننھی سی بوند سے ہُوا وہ سرسیّد اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے آہستہ آہستہ ایک سیلِ رَواں کی شکل اختیار کر گیا۔ اس فنڈ کی وافر فراہمی کی وجہ سے ہی مدرسۃ العلوم کی بلند و بالا اور عظیم الشان عمارات کی تعمیر اتنے غیر معمولی اور اِتنے شاندار خطوط پر ہوئی کہ دُنیا حیران رہ گئی۔ مولانا حالؔی کے قول کے مطابق ایک انگریز سیاح کا کہنا ہے کہ دُنیا میں کہیں بھی کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرز پر بنی ہوئی مدرسۃ العلوم علی گڑھ جیسی درسگاہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ بورڈنگ ہاؤس میں جو کمرے طلبہ کے رہنے کے لئے یہاں بنائے گئے ہیں ویسے عمدہ کمرے کیمبرج اور آکسفورڈ میں بھی نہیں ہیں۔ جو شخص اس عمارت کی شان و شوکت اور عظمت و جلال کو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ ایک انگریزی اخبار نے جو لندن سے شائع ہوتا تھا لکھا کہ سرسیّد نے یہ محیرّ العقول کارنامہ انجام دے کر ثابت کر دیا ہے کہ اس مری اور کچلی ہوئی حالت میں بھی

مسلمان قوم یہ معجزہ دکھا سکتی ہے۔

سر سیّد کے محیرّ العقول کارنامے کی حقیقی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیئے اس اَمر کا خیال کرنا ضروری ہے کہ جو حال اور مزاج مسلمان قوم کا 1857ء کی ابتلا کے بعد تھا اس کو دیکھ کو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس قوم کے افراد کو کسی قومی اور اجتماعی کام کے لیئے باہمی تعاون پر آمادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ شکست خوردہ اور زوال آمادہ مسلمان انتہائی مایوسی اور نا اُمیدی کا شکار ہو چکے تھے۔ اپنے تاریک مستقبل کے اُفق پر دُور دُور تک انہیں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ ظلمت کی بے کنار اور اتھاہ گہرائیوں میں انہیں کوئی راستہ سُجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ حوصلہ ہار بیٹھے تھے۔ مخالف حالات و واقعات کے تند و تیز ریلے میں وہ بے یار و مددگار ایک بے بس تنکے کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔ نہ کسی منزل کا سُراغ تھا نہ سمت کا پتہ۔ اس عالم میں سر سیّد نے ایک پیغمبر کی طرح انہیں پکارا۔ انہیں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لیئے آواز دی۔ کسی کو یقین نہ تھا کہ کوئی اس آواز پر کان دھرے گا۔ سر سیّد جب انگلستان کی درسگاہوں کو دیکھنے کے لیئے وہاں جانے کا پروگرام بنا رہے تھے تو انہوں نے ایک دن اپنے ایک معزز قریبی رشتہ دار نواب امو جان سے باتوں باتوں میں کہا ''کیوں حضرت آپ کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیم کے لیئے دس لاکھ روپیہ جمع ہو سکتا ہے یا نہیں؟'' انہوں نے نہایت تعجب سے کہا ''تم کیا دیوانوں کی سی باتیں کرتے ہو مسلمانوں سے دس لاکھ پیسے بھی وصول نہیں ہو سکتے۔''[65]

قومی ہمدردی کے فقدان اور کسی اجتماعی قومی کام کے لیئے باہمی تعاون کے تصور کی عدم موجودگی کچھ تو اس مایوسی اور نا اُمیدی کے سبب تھی جو مسلمانانِ ہند کو اس وقت چاروں جانب سے گھیرے ہوئی تھی مگر اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اپنی مدد آپ کی بنیاد پر فلاح و بہبود کے کسی قومی اور اجتماعی کام کے لیئے اپنے انفرادی وسائل کو یکجا کرنے کا ہندوستان کے مسلمانوں کو اس سے پہلے نہ کوئی تجربہ تھا نہ ہی اس طرح کے کسی تصور ہی سے وہ آشنا تھے۔ شخصی حکومتوں میں اس طرح کے کام بادشاہوں کی مرضی اور صوابدید پر منحصر ہوتے تھے۔ عوام اگر ان میں کبھی شریک بھی ہوتے تھے تو حکومت کے دباؤ کے تحت ورنہ اس طرح کے کاموں سے وہ ہمیشہ لاتعلق رہتے تھے۔ جہاں فکر و عمل کی شخصی آزادی نہ ہو وہاں عام لوگوں کو معاشرے کی اجتماعی بھلائی کے لیئے کوئی قدم اٹھانے کا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کالج کا باقاعدہ سنگِ بنیاد رکھنے سے پہلے ہی ابتدائی مدرسہ کا آغاز 1875ء میں کر دیا گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد مدرسے کو ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ مدرسہ 1881ء میں کالج بن گیا اور بی اے تک

کی کلاسیں شروع ہوگئیں۔ 1884ء میں اس کالج کے طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں امتحان دینے لگے۔

سرسیّد کے نزدیک مدرسۃ العلوم (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) علی گڑھ کے قیام کی غرض وغایت انہی کے الفاظ میں یہ تھی۔

> ''ہم اس مدرسۃ العلوم کو محمڈن یونیورسٹی یعنی دارالعلومِ مسلماناں بنانا اور بالکل آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی (جس کو ہم دیکھ آئے ہیں) نقل اتارنا چاہتے ہیں۔''[66]

بقول حالیؔ ''ان کا مقصد محمڈن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد جو 1857ء سے لیکر اخیر دم تک ان کے پیشِ نظر رہا، یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یکجہتی، میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لیے انہوں نے یورپین اسٹاف کو کالج کا جزوِلاینفک قرار دیا تھا۔''[67]

1897ء میں سرسیّد نے مدرسۃ العلوم کے بارے میں کہا'' کالج نے اپنے وجود کے بیس سال کے عرصے میں تعدادِ طلبہ میں، عمارات میں اور شہرت میں اس قدر ترقی کی ہے کہ ہم کو اس کی توقع نہ تھی مگر پھر بھی آخری مقصود ابھی بہت دُور ہے اور ہم کو توقع نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں وہ حاصل ہو، وہ مقصد ہندوستان میں کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے نمونے پر مسلمانوں کے واسطے اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہوجانا ہے۔''[68]

سرسیّد کے اس خواب کی تعبیر 1920ء میں ظہور پذیر ہوئی جب مدرسۃ العلوم (محمڈن کالج) علی گڑھ کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا درجہ دے دیا گیا۔

سرسیّد کی بے غرضی اور بے لوثی بلکہ ان کی انسانی عظمت کا اندازہ اس سے کریں کہ ہر چند کہ سرسیّد اس عظیم درسگاہ کے بانی تھے اور انہی کی شبانہ روز اَن تھک کوششوں سے یہ معجزہ رونما ہوا تھا مگر انہوں نے ہرگز اس کی اجازت نہ دی کہ مدرسے میں کہیں ان کے نام کی کوئی تختی یا کتبہ نصب کیا جائے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس بات سے انکار کرتے رہے کہ وہ مدرسے کے بانی ہیں یا مدرسۃ العلوم انہی کی وجہ سے قائم ہوا ہے وہ اُسے مسلمانوں کی اجتماعی کوششوں کا ثمر بتاتے تھے۔ مدرسے کے آغاز سے پہلے جب سرسیّد کے بہی خواہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مدرسے کا نام سرسیّد احمد خان کے نام پر مدرسۃ احمدیہ رکھنا چاہیئے تو انہوں نے اس تجویز کی اتنی سختی سے مخالفت کی کہ یہ خیال وہیں دم توڑ گیا۔ کالج کے انگریز پرنسپل نے ایک

دفعہ جب یہ خیال پیش کیا کہ جس طرح انگلستان کے بعض مشہور پبلک سکولوں اور کالجوں میں فاؤنڈرز ڈے یعنی بانیٔ مدرسہ کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے، مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بھی سرسیّد کی سالگرہ کی تقریب کا اہتمام ہونا چاہیئے۔ سرسیّد نے کہا میری سالگرہ کے بجائے مدرسہ کی سالگرہ منائی جائے یعنی فاؤنڈرز ڈے کے بجائے کالج کا فاؤنڈیشن ڈے منایا جائے، چنانچہ کئی سال تک فاؤنڈیشن ڈے کی تقریب باقاعدگی سے منعقد ہوتی رہی۔

ہنٹر کی کتاب کا جواب

انہی دنوں جب 1871ء میں سر سیّد مدرسۃ العلوم یعنی محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ کے قیام کی تحریک اٹھا رہے تھے اور رات دن اسی فکر میں محو تھے انہیں ایک اور چیلنج کا سامنا کرنا پڑا اُسی سال ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی مشہور کتاب ''آور انڈین مسلمانز'' Our Indian Mussalmans شائع ہوئی۔ ڈاکٹر ہنٹر نے اس کتاب میں لکھا کہ مسلمان کبھی انگریزوں کے وفادار اور خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ انگریزوں سے لڑنا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ یہ کتاب دیکھتے ہی سر سیّد کو خطرہ محسوس ہوا کہ 1857ء سے اب تک مسلمانوں اور انگریزوں کو قریب لانے کی جس قدر کوششیں انہوں نے کی ہیں یہ کتاب ان سب پر پانی پھیر دے گی۔ سر سیّد کے نزدیک مسلمانوں کی بہتری اور ان کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی یہی ایک ممکنہ صورت تھی کہ دشمنی اور نفرت کی جو خلیج ان دونوں قوموں کے درمیان حائل ہو چکی تھی اسے دوستی، یکجہتی اور خیر سگالی کے جذبات سے پُر کیا جائے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر مدرسۃ العلوم کے قیام اور اس میں انگریزی سٹاف کے تقرر کا منصوبہ بھی مسلمانوں میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور انگریزوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی غرض سے تھا۔ مسلمانوں کے اقتدار کا زمانہ خواب و خیال ہو چکا تھا۔ انگریزی اقتدار اپنے پورے جاہ و جلال اور قوت و سطوت کے ساتھ قائم تھا۔ مسلمانوں کی بقا اسی میں تھی کہ وہ حالات کے تیور پہچانیں اور ان سے سمجھوتہ کرنے کی کوئی صورت نکالیں تا کہ 1857ء کے خونریز ہنگامے کے بعد جو کچھ تباہ و برباد ہونے سے بچ گیا ہے اسے ضائع ہونے سے روکا جا سکے اور مستقبل میں بہتری کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف جو بدگمانی بلکہ دشمنی جاگزیں ہو گئی تھی اس کی شدت کو کم کیا جائے تا کہ مسلمان مزید ان کے انتقام کا نشانہ نہ بنیں۔ سر سیّد اِس فکر اور جدو جہد میں دن رات مصروف کار تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر ہنٹر انگریزوں کو خبردار کر رہا تھا کہ مسلمانوں سے ہوشیار رہیں اور ان پر کبھی اعتبار نہ کریں۔ سر سیّد فوراً اس طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے ڈاکٹر ہنٹر کی پکار کو مکمل طور پر غیر موثر کرنے کی ٹھان لی۔ سر سیّد نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ایک مفصل اور مدلل ریویو لکھا جس میں یہ ثابت کیا کہ ڈاکٹر ہنٹر کو دینِ اسلام کا کچھ پتہ نہیں اور یہ کہ اس نے مسلمانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے لاعلمی اور غلط فہمی کی بنا پر لکھا ہے۔

سر سیدؒ نے قرآن و حدیث سے مستند حوالے دے کر واضح کیا کہ ہندوستان کی مختلف اقوام میں اگر کوئی قوم انگریزوں کی خیر خواہ اور وفادار ہو سکتی ہے تو وہ صرف مسلمانوں کی قوم ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان پر نازل کی گئی مقدس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی حضرت عیسیٰ پر اور ان کی مقدس کتاب بائبل پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآنِ حکیم مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ وہ تو اہلِ کتاب سے دوستی اور خیر سگالی کے جذبات کی تلقین کرتا ہے۔ سر سیدؒ نے اپنے موقف کی تائید میں قرآنِ حکیم کی اس آیت کا حوالہ دیا جس کا مطلب ہے کہ:

> ''اے محمدؐ! تم پاؤ گے تمام آدمیوں میں سخت دشمن مومنین کا یہودیوں اور مشرکوں کو اور پاؤ گے مومنین کا سب سے زیادہ دوست ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں۔'' **(سورہ المائدہ)**

سر سید نے تاریخی حوالے دے کر وضاحت کی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت یا پوزیشن وہی ہے جو ہجرت حبشہ کے بعد عیسائی بادشاہ نجاشی کے تحت تھی۔ وہ نجاشی کی پناہ میں تھے اور اس لیئے اس کے خیر خواہ اور وفادار تھے۔ اسی طرح شرعی طور پر ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے خیر خواہ اور وفادار رہنے کے پابند ہیں۔ جب تک حکومت ان کے دینی اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں حارج یا مخل نہیں ہوتی، حکومتِ وقت کی فرماں برداری ان پر فرض ہے۔ حکومت کے خلاف سازشیں کرنا یا اس کے خلاف جنگ و جدل اور جہاد کا خیال اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ سر سیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو قائل کرنے کی جو بے پناہ قوت عطا فرمائی تھی اس کو بروئے کار لاتے ہوئے سر سیدؒ نے اس خوبی اور موثر انداز سے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا توڑ اپنے ریویو میں کیا کہ سر سیدؒ کا تبصرہ پڑھنے کے بعد لوگ ڈاکٹر ہنٹر پر تعجب کرنے لگے کہ اس نے ایسی جاہلانہ کتاب کیوں کر لکھی۔ سر سیدؒ کے ریویو پر اظہار خیال کرتے ہوئے اخبارات نے لکھا'' ہم نہیں جانتے (ڈاکٹر ہنٹر کے علاوہ) کسی مصنف نے دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو۔''[69]

حالی لکھتے ہیں'' سر سیدؒ کا یہ ریویو بزبانِ انگریزی جب لندن کے اخبارات میں شائع ہوا اور اس پر تبصرے کیئے گئے تو لندن سے ایک دوست نے لکھا'' اس ریویو کے شائع ہونے سے لوگوں کی طبیعتوں کا ایسا حال ہو گیا تھا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے۔ جو شخص اس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر تعجب کرتا تھا اور جو کچھ انہوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔''[70]

خود ڈاکٹر ہنٹر پر سر سیدؒ کی تحریر کا بڑا عمدہ اثر پڑا۔ وہ سر سیدؒ کی لیاقت اور عظمت کا قائل ہو گیا اور مدرسۃ العلوم کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک کمرے کی تعمیر کے لیئے اس نے اپنی جیب سے ڈیڑھ ہزار روپیہ بطور چندہ دیا۔

سر سیدؒ کا یہ مفصل ریویو 24 نومبر 1871ء سے 23 فروری 1872ء تک سائنٹیفک سوسائٹی کے اخبار علی گڑھ گزٹ میں قسط وار چھپتا رہا۔ سر سیدؒ کی علمی اور قلمی کاوشوں میں یہ تحریر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

تفسیر القرآن

1876ء میں سرسیّد نے تفسیر القرآن لکھنے کا ارادہ کیا۔ مدرسۃ العلوم کا باقاعدہ آغاز ابھی نہیں ہوا تھا کہ سرسیّد نے مسلمانوں کے دین و مذہب پر مغربی تعلیم کے ممکنہ مُضر اثرات کا سدِباب کرنے کی ٹھان لی۔ انگلستان میں وہ دیکھ آئے تھے کہ جدید علوم وفنون کی تعلیم واشاعت نے عیسائیوں کو اپنے مذہب سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ یہی اثرات ان کے مدرسۃ العلوم سے مسلمانوں پر مرتب ہوں ۔اس سلسلے میں ان کے جذبات واحساسات کا اندازہ ان کی ایک تقریر کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے 1876ء میں مدرسہ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کی۔ انہوں نے کہا:

''یادرکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علومِ جدیدہ و دینِ اسلام) کے نمونے ہوگے۔ جبھی ہماری قوم کی عزت ہوگی۔''[71]

اسی مسئلے پر غور وفکر کرتے ہوئے سرسیّد اس نتیجے پر پہنچے کہ مغربی علوم خاص کر طبیعیات کے علم کا سامنا کرنے کے لیئے اہلِ اسلام کو ایک نئے علمِ کلام کی ضرورت ہے۔ عہدِ عباسیہ کا وہ علم کلام جس نے یونانی فلسفے کا موئثر انداز میں مقابلہ کیا تھا اور یونانی فلسفہ وحکمت کے سوالات کا مسکت اور مدلل جواب اِسلامی شریعت کی روشنی میں دیا تھا اب کام نہیں دے سکتا۔ صرف فلسفہ اور منطق سے طبیعیات کے سوالات اور اس کے پیدا کردہ شبہات کا اطمینان بخش جواب نہیں دیا جا سکتا۔ طبیعیات تو اپنے علم کو تجربہ گاہ میں لے آئی ہے اور اپنے دعوؤں کا عملی ثبوت پیش کر رہی ہے۔ اپنے علوم کا مشاہدہ کروا رہی ہے۔

اپنی دریافتوں کو آنکھوں سے دکھا رہی ہے۔ جب تک نئے علوم کی ان دریافتوں اور انکشافات کو جو بظاہر اسلامی علوم کے خلاف نظر آتے ہیں اور ان کی تکذیب کرتے دکھائی دیتے ہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق ثابت نہ کیا جائے یا اسلامی علوم کے دعوؤں کی ایسی تعبیر نہ کی جائے جو ان دریافتوں اور انکشافات کی مانع نہ ہو، اس وقت تک جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن میں اُٹھنے والے شکوک وشبہات کو دُور نہیں کیا جا سکتا۔ محض کہانیوں اور داستانوں سے منطقی اور تحقیقی اذہان مطمئن نہیں ہو سکتے۔ عیسائی مبلغین اور مشنری دینِ اسلام کے جھوٹا ہونے کے جو ثبوت پیش کر رہے تھے ان کا توڑ اسلامی علوم کی موجودہ کتابوں سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سر سیّد کے زمانے تک قرآنِ حکیم کی جو متعدد اور مختلف تفسیریں لکھی جا چکی تھیں اُن میں ان سوالات کا کوئی جواب موجود نہیں تھا، جو نیچریوں اور مشنریوں کی طرف سے اٹھائے جا رہے تھے۔ کسی تفسیر میں تاریخی، جغرافیائی اور سائنسی تحقیق کے حوالوں سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ چنانچہ سر سیّد نے ایک نئی تفسیر لکھنے پر کمر ہمت باندھ لی۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ پوری زندگی اسی ایک کام کے لئے درکار تھی مگر اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود سر سیّد نے ایک ایسے مشکل اور کٹھن راستے پر سفر کا آغاز کر دیا، جس کی ان سے پہلے، عالمِ اسلام میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے ایک نئے، علمِ کلام کی بنیاد رکھی۔ اس مقصد کے لیئے انہوں نے پچھلی تمام تفسیروں کا جائزہ لیا۔ بائبل کو بغور پڑھا۔ جن تاریخی حقائق کی طرف قرآنِ حکیم محض اجمالاً اشارے کرتا ہے اس کی تحقیق کی۔ عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید کی کتب میں ان تاریخی واقعات کو ڈھونڈا جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ مشنری اور علم وتحقیق کے متلاشی تقریباً جتنے اعتراضات اسلام پر کرتے ہیں، وہ قرآنِ حکیم کے متن پر نہیں ہیں، بلکہ قرآنِ حکیم کی تفسیروں اور کتبِ احادیث میں بیان کئے گئے مختلف قصے کہانیوں پر ہیں۔ جن کی کوئی سند قرآنِ حکیم سے نہیں ملتی۔ گویا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پھیلائے گئے پروپیگنڈے کی بنیاد اللہ کے کلام (قرآنِ حکیم) پر نہیں بلکہ انسانوں کے اقوال وبیانات پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے تفسیر القرآن لکھتے وقت پہلا بنیادی اُصول اپنے سامنے یہ رکھا کہ جس چیز کا ذکر قرآنِ حکیم میں نہیں ہے اور جس بات کی سند قرآنِ حکیم سے نہیں ملتی اُسے اپنی تفسیر سے خارج سمجھا۔ قرآنی الفاظ کے وہی معنی لیئے جو نزولِ قرآن کے زمانے میں اہلِ عرب لیتے تھے۔ جن الفاظ کو وہ تشبیہ یا استعارے کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے اُن الفاظ کے مطالب پر بحث کرتے ہوئے ان کے استعاراتی پہلوؤں کو بھی مدِ نظر رکھا۔ اس مقصد کے

لئے سرسید نے دورِ جہالت کی شاعری کا مطالعہ بھی کیا، تا کہ عربی الفاظ کے صحیح مطالب و معانی تک رسائی ہو۔ اس لائحہ عمل کو سامنے رکھ کر سرسید نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کا یہ جو دعویٰ ہے کہ اسلام عین حق و صداقت ہے اور اس میں کوئی بات علم و حکمت اور صداقت کے خلاف نہیں ہے تو اس سے ہماری مراد کیا ہے۔ ہم کس طرح اور کیونکر اسلام کو دینِ فطرت کہتے ہیں اور کس طرح یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلام قوانینِ فطرت کے مطابق ہے۔ فطرت کو سرسید ورک آف گاڈ Work of God کہتے تھے اور قرآنِ حکیم کو ورڈ آف گاڈ Word of God اور ان کا مؤقف یہ تھا کہ ان دونوں میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

تفسیر القرآن کی جب پہلی قسط تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئی تو جس طرح ان کے ہر کام کی مخالفت ہوتی تھی، ان کی تفسیر کی بھی بڑی شدومد سے مخالفت کی گئی۔ انہیں ملحد، مرتد اور نیچری کہا گیا۔ مگر سرسید اپنی دُھن کے پکے تھے۔ وہ رات دن اپنی مصروفیات میں منہمک رہے۔ ان مصروفیات کا بیشتر حصہ تفسیر کے سلسلے میں مطالعے اور تحریری کاموں پر مشتمل تھا۔ دن کو سرسید مدرسۃ العلوم کے لئے چندہ اکٹھا کرنے، مدرسے کی عظیم الشان عمارت کی تعمیر کی نگرانی کرنے، اس کے سبزہ زاروں میں پودے اور پھول لگوانے میں اور اس کے انتظامی امور کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے اور راتوں کو تفسیر القرآن لکھنے بیٹھ جاتے۔ انہیں تفسیر لکھنے کے کام کی اہمیت اور ضرورت کا شدت سے احساس تھا۔ وہ لکھتے ہیں:-

> ''جب کہ میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے، صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو، اس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کے اصلی نُورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھاؤں۔ میرا کانشینس (Conscience) مجھ سے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا۔''[72]

حالی لکھتے ہیں ''خصوصاً اس حالت میں جب کہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو، نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اس کے سرسید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور باوصف سخت مخالفتوں کے جو قوم کی طرف سے ہوئیں اور باوجود اِن بے شمار مشکلات کے جو تفسیر لکھتے وقت ان کو پیش آتی تھیں،

نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض سمجھ کر انجام دیتے رہے۔"[73]

مولویوں نے سر سیّد کی شدید مخالفت کی اور ان کی تفسیر کے رد میں کتابیں لکھیں، جن میں کہیں سر سیّد کو نبوت کا منکر، کہیں فرشتوں اور کہیں جنت اور دوزخ کا منکر قرار دیا۔ انہیں چاہیئے تھا کہ اگر ان کے دل میں مسلمانوں کا درد اور اسلام کی حمایت کا صحیح جذبہ تھا تو سر سیّد کے بنیادی سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے۔ وہ سوال یہ تھا کہ کیا جدید تعلیم مذہبی اعتقادات کے لیئے خطرہ ہے؟ اگر خطرہ ہے تو کیا مسلمانوں کو جدید تعلیم اور نئے علوم سے محروم رکھا جائے یا اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے اور ان شکوک وشبہات کا تسلی بخش جواب ڈھونڈا جائے جو پڑھے لکھے نوجوانوں میں پیدا ہو رہے تھے یا پیدا کیئے جا رہے تھے۔ جو لوگ سر سیّد پر کیچڑ اُچھال رہے تھے، غالباً وہ اس طرح کی سوچ یا کوشش کے اہل ہی نہ تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے قدیم روایت سے چمٹے رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سر سیّد نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ حرفِ آخر ہے۔

جس نئے علمِ کلام کو بنیاد بنا کر سر سیّد نے قرآنِ حکیم کے مطالب ومعانی کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس سمت میں جو نیا راستہ دکھایا، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے اس کی کوئی نظیر سر سیّد سے پہلے موجود نہ تھی، مگر سر سیّد کے بعد علامہ اقبالؒ، علامہ حمید اللہ فراہی، غلام احمد پرویز، مولانا امین احسن اصلاحی اور موجودہ دور میں جناب جاوید احمد غامدی نے اسی انداز اور طریقے پر قرآنِ حکیم کی تعبیر وتفسیر کی ہے۔ اس میدان میں بلاشبہ سر سیّد احمد خان کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے جو چراغ روشن کیا، ان کے بعد آنے والوں نے اس کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کیا۔

سر سیّد 1898ء میں اپنی وفات تک تفسیر القرآن لکھتے رہے۔ وہ اپنی زندگی میں اس کام کو مکمل نہ کر سکے۔ ابھی سورہ بنی اسرائیل تک تفسیر لکھی تھی کہ پیغامِ اجل آ پہنچا۔ تفسیر القرآن کے چھ حصے یا چھ جلدیں شائع ہوئیں۔ یہ بھی کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ بڑی تقطیع پر چھپے ہوئے کل 1130 صفحات بنے۔ اس میں قرآنِ حکیم کے تقریباً سارے بنیادی اور اختلافی مسائل آ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مضامینِ قرآن پر سر سیّد نے متعدد رسالے بھی لکھے۔ جن میں رسالۂ ابطالِ غلامی خاص اہمیت رکھتا ہے۔

رسالۂ ابطالِ غلامی

عیسائی مشنری سب سے بدنما داغ جو اسلام کے روشن چہرے پر لگاتے تھے وہ مسلمان ممالک میں بردہ فروشی کا رواج تھا۔ وہ یہ پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے پیروؤں کو علی الاعلان دوسروں کو غلام بنانے کا حکم دیتا ہے اور اس بنا پر ان کا دعویٰ تھا کہ اسلام اور تہذیب وشائستگی یکجا نہیں ہو سکتے۔ جب مصر کے بادشاہ اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نے غلاموں کی خرید وفروخت کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے ممنوع قرار دیا تو ایک انگریز مصنف مسٹر رسل نے اسمٰعیل پاشا کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ اس نے اپنے مذہب اور اپنے ایمان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ نیکی کا کام کیا ہے۔ یعنی عام دُنیا میں تاثر یہ تھا کہ اسلام لوگوں کو غلام بنانے، غلاموں کی خرید وفروخت کرنے اور غلام بنا کر رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی تہمت تھی جو مخالفین مسلمانوں پر اور اسلام پر لگاتے تھے۔ کسی مسلمان عالم نے کبھی اس بے جا الزام کا جواب نہیں دیا تھا اور اس اَمر کی وضاحت نہیں کی تھی کہ دینِ اسلام میں غلامی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سرسید احمد خان عالم اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے واضح کیا کہ اسلام نے غلامی کو ممنوع قرار دیا ہے۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں یہ بیان کیا کہ قرآنِ حکیم میں کہیں بھی غلاموں کی خرید وفروخت اور گھروں میں غلاموں کو رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی اجازت ہے۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہاں بھی اس کا حکم ہے نہ اجازت۔ سرسید احمد خان نے مخالفین کو چیلنج کرتے ہوئے لکھا کہ کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس میں غلاموں کی خرید وفروخت کا حکم ہو یا غلامی کے رواج کو جائز یا پسندیدہ قرار دیا گیا ہو۔ بلکہ اسلام میں ہر جگہ یہی کہا گیا ہے کہ جو غلام پہلے سے چلے آتے ہیں انہیں آزاد کر دو۔ غلاموں کو آزاد کرنے کی خاطر طرح طرح سے ترغیبات دی گئی ہیں۔ اسلام میں غلاموں کو آزاد کرنا سب نیکیوں سے افضل ہے۔ قرآن وحدیث میں غلاموں کا جہاں بھی ذکر ہے وہ اسی ضمن میں ہے کہ ہر حال میں ان سے نرمی اور شفقت کا سلوک کیا جائے۔ قرآنِ حکیم میں واضح

طور پر ارشاد ہوا ہے کہ اپنے غلاموں کو وہی کھانا کھلاؤ جو خود کھاؤ اور وہی کپڑے پہناؤ جو خود پہنو۔ کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ بردہ فروشی مباح ہے یا اس کی اجازت ہے، یا غلاموں کو خرید کر گھر میں رکھو۔ جہاں تک جنگ میں پکڑے جانے والے قیدیوں کو غلام بنانے کا تعلق ہے سر سیّد احمد خان نے سورہ محمدؐ کی آیت نمبر 4 کا حوالہ دے کر بتایا کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں یہ واضح حکم موجود ہے کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دو اور اگر وہ فدیہ نہیں دے سکتے تو انہیں احسان کے طور پر آزاد کر دو۔ نہ انہیں قتل کرنے کی اجازت ہے اور نہ غلام بنانے کی۔ سر سیّد نے واضح کیا کہ اسلام سے پہلے عرب میں یہ رواج تھا کہ قیدیوں کو یا تو قتل کر دیتے تھے یا غلام بنا لیتے تھے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیتے تھے۔ اس آیت نے قیدیوں کو قتل کرنے یا انہیں غلام بنا کر رکھنے کی ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ انہیں فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دو یعنی جو فدیہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتے، ان پر احسان کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دو۔ سر سیّد نے تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ سورہ محمدؐ میں اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کسی قیدی کو قتل کیا گیا نہ کسی قیدی کو غلام بنایا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے غلامی کی واضح طور پر ممانعت کر دی ہے۔ اس مسئلے پر یہودی اور عیسائی مذاہب کا اسلام سے مقابلہ کر کے سر سیّد نے یہ لکھا کہ بائبل میں کہیں غلامی کی ممانعت یا غلاموں کو آزاد کرنے یا ان سے اچھا برتاؤ کرنے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ سینٹ پال نے اپنے خطوط میں غلاموں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کے آگے سر جھکائیں۔ اُن کی اطاعت کریں، ان سے ڈریں، ان کی ایسی فرمانبرداری کریں جیسی حضرت عیسیٰؑ کی کرتے ہیں۔ اس کے بعد سر سیّد نے لکھا کہ پیغمبرِ اسلام نے تو کہیں غلاموں کو اپنے آقاؤں کے سامنے سر جھکانے یا انؐ کی تعظیم و تکریم کرنے یا اطاعت کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اُنؐ کی زبانِ اقدس پر جب بھی غلاموں کا ذکر آیا اسی حوالے سے آیا کہ جن کے پاس کوئی غلام ہے اگر وہ اس کو آزاد کر دے تو اس سے بڑی نیکی کوئی اور نہیں ہے۔ غلاموں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کیا جائے۔ ان سے زیادہ کام نہ لیا جائے ۔ انہیں غلام کہہ کر نہ پکارا جائے۔ انہیں اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا جائے اور وہی کپڑے ان کو پہنائے جائیں جو اُن کے مالک خود پہنتے ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے نہ صرف زبانی طور پر غلاموں سے شفقت اور برابری کا سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی بلکہ عملی طور پر اپنی زندگی میں ان سے شفقت اور برابری کا سلوک کر کے آنے والی نسلوں کے لئے مثال قائم کی جس پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اگر وہ اس

فرض کو ادا نہیں کرتے اور قرآنِ حکیم کی آیات کی روشنی میں غلامی کی جو ممانعت کر دی گئی ہے اس پر عمل نہیں کرتے تو اس میں اسلام موردِ الزام نہیں ٹھہرتا بلکہ سارا قصور مسلمانوں کا ہے کہ وہ اپنے مذہبی احکامات پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور اپنے اپنے علاقوں کے قدیم رسم و رواج کو اپنائے ہوئے ہیں۔

سرسیّد نے یہ طویل مضمون پہلے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق میں قسط وار شائع کیا اور پھر رسالہ ابطالِ غلامی کے نام سے اُسے الگ کتابی صورت میں چھپوایا۔

حالؔی لکھتے ہیں کہ سرسیّد کے رسالہ ابطالِ غلامی کی اشاعت کے انتیس سال بعد مصر کے ایک دانشور احمد شفیق بک نے فرانسیسی زبان میں ایک کتابچہ اسی مضمون کا لکھا۔ احمد ذکی آفندی نے اس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ احمد شفیق بک نے چونکہ فرانسیسی زبان میں لکھا تھا اس لیے یورپ میں اس کے رسالے کو بڑی شہرت ملی اور اہلِ نقد و نظر نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی۔ مصر کے اسلامی اخبار المویدنے احمد شفیق بک کے رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اِسلام کی حمایت میں اس سے عمدہ اور افضل کوئی تصنیف نہیں ہوگی۔ مگر سرسیّد احمد خان کو جنہوں نے یہ کارنامہ احمد شفیق بک سے اُنتیس سال پہلے انجام دیا، اپنے ملک میں اپنے ہم مذہبوں سے داد و تحسین کی بجائے طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا جہاں جاہل مولویوں نے اس رسالے کے رد میں مضامین لکھے۔

کونسل کی رُکنیت

1876ء میں سر سیّد ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ اب وہ دِن بھر مدرسۃ العلوم کی تعمیر و ترقی میں مصروف رہنے لگے اور اُن کی راتیں مطالعے اور تصنیف و تالیف کی نذر ہونے لگیں۔ 1877ء میں مدرسۃ العلوم کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ رسم وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے ہاتھوں ادا ہوئی۔ اس موقع پر اتنی شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا کہ اس سے پہلے کسی تعلیمی ادارے کے سلسلے میں اس سطح کی کوئی تقریب پوری ملکی تاریخ میں کبھی منعقد نہیں ہوئی۔ وائسرائے ہند جو بلاشرکتِ غیرے پورے ہندوستان کا مطلق العنان حکمران تھا اور جس کی حیثیت اکبرِ اعظم یا اورنگ زیب عالمگیر جیسی تھی، مدرسۃ العلوم کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے آیا۔ ملکی سطح پر اس وقت سر سیّد احمد خان کی کیا حیثیت و اہمیت تھی اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب وائسرائے سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت کے لیے علی گڑھ آیا تو اس نے سر سیّد کے ہاں قیام کیا۔ علی گڑھ میں انگریز کمشنر بھی موجود تھا۔ وائسرائے کے لیے سرکاری سطح پر قیام و طعام کا بڑا شاہانہ انتظام کیا جا سکتا تھا مگر اس نے سر سیّد کا ذاتی مہمان بننے کو ترجیح دی۔ یہ بات جہاں لارڈ لٹن کی علم دوستی اور ذاتی بڑائی کی دلیل ہے وہاں سر سیّد کی اہمیت کی بھی آئینہ دار ہے۔

1878ء میں لارڈ لٹن نے سر سیّد احمد خان کو وائسرائے کی لجسلیٹو کونسل (مجلسِ قانون ساز) کا ممبر نامزد کیا۔ یہ منصب گویا آج کل کے وفاقی وزیر کے برابر ہے۔ وائسرائے کی لجسلیٹو کونسل ایک لحاظ سے وائسرائے کی کابینہ تھی۔ اس تقرری کے بارے میں انگریزی اخبار بمبئی گزٹ نے ادارتی نوٹ میں لکھا کہ جیسا کہ سر سیّد نے اپنے رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند میں تجویز دی ہے کہ وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کو بھی نمائندگی دی جائے تا کہ وہ ملکی حالات سے کونسل کو باخبر رکھ سکیں اور اعلیٰ ترین سطح پر حکومت کو ضروری مشورے دے سکیں، تو سر سیّد کی اِسی تجویز پر عمل کرتے ہوئے اُنھیں کونسل کا رکن نامزد

کیا گیا ہے۔ سر سیّد چار سال تک کونسل کے ممبر رہے اس دوران انہوں نے اپنی کوششوں سے کئی مسودہ ہائے قانون تیار کیئے اور کونسل سے منظور کروائے۔ اِن میں چیچک کے ٹیکے کا قانون اور مسلمانوں کے لئے قاضیوں کے تقرر کا قانون مشہور ہیں۔ بقول حالؔی ہندوستان میں سر سیّد پہلے شخص ہیں جنہوں نے کونسل کی ممبری کے زمانے میں ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیئے قانون بنوایا۔ مسلمانوں کے فائدے کے لیئے ایک اور مسودہ قانون وقفِ خاندانی کے نام سے انہوں نے بڑی محنت سے تیار کیا مگر کچھ ناگزیر قانونی رکاوٹوں اور مروجہ ضابطے کی مجبوریوں کی وجہ سے اُسے منظور نہ کیا جا سکا۔ سر سیّد کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیئے بڑی محنت اور تیاری کر کے آتے اور اس کام کو اہم قومی فریضہ سمجھتے۔ کونسل کی ساری کارروائی انگریزی میں ہوتی۔ سر سیّد انگریزی میں واجبی سی لیاقت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کونسل میں تقریر کرنے کے لیئے یہ لائحہ عمل اختیار کیا کہ اپنی تقریر اُردو میں لکھتے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں کرواتے پھر اس انگریزی عبارت کو فارسی رسم الخط میں لکھواتے۔ اجلاس سے پہلے کئی بار اُسے پڑھنے کی مشق کرتے تاکہ بغیر کسی رکاوٹ یا جھجک کے تقریر کی ادائیگی کر سکیں۔ سننے والوں کو کم ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ لکھی ہوئی جو تقریر انگریزی میں ادا کر رہے ہیں، وہ اُردو یا فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ سر سیّد جس موضوع پر بھی بولے، بڑے مدلل اور مفصل انداز میں بات کی، وہ مسئلہ زیرِ بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے دیتے۔ موضوع سے متعلق تمام معلومات بہم پہنچاتے اور سامعین کو اپنے نقطۂ نظر کے حق میں قائل کرنے کا جو قدرتی ملکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا تھا اس سے پورا پورا کام لیتے۔ وائسرائے لارڈ لٹن جیسے عالم فاضل اور اَدیب شخص نے کئی دفعہ ان کی تقریر کی تعریف کی۔ خاص کر مسودۂ قانون مزارعانِ دَکن پر جو تقریر سر سیّد نے کی، لارڈ لٹن نے اس کی بڑی تعریف کی۔ سر سیّد بتاتے ہیں کہ ''جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سنی۔''[74]

سر سیّد کے سب سے پہلے سوانح نگار کرنل گراہم نے اپنی کتاب ''لائف اینڈ ورک آف سر سیّد احمد خان'' میں یہ تقریر نقل کی ہے۔

26 جنوری 1882ء کو مسودۂ قانون انتقالِ جائیداد پر جو طویل تقریر سر سیّد نے مجلسِ قانون ساز میں کی، اس پر انگریزی اخبار انگلش مین نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا ''کسی ہندوستانی جنٹلمین نے اب

تک اس مسئلہ کی تائید کہ ملک کے قانون کا کوڈی فی کیشن (Codification) ہونا چاہیئے، ایسی صراحت کے ساتھ نہیں کی ہے جیسی کہ آنریبل سیّد احمد خان نے کی ہے۔''

12 جنوری 1883ء کو لوکل گورنمنٹ بل پر جو تقریر سر سیّد نے مجلسِ قانون ساز میں کی وہ اس قدر سیاسی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے چند اقتباسات یہاں نقل کئے بغیر آگے بڑھ جانا مناسب نہ ہوگا۔ یہ تقریر انگریزی میں ہے اس کا مفہوم حسب ذیل ہے:۔

''میں اس خیال سے خوش ہوں کہ میں اس وقت تک زندہ رہا کہ میں نے اس دِن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سیلف ہیلپ اور سیلف گورنمنٹ کے وہ اُصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے انگلستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹیٹیوشنز (ادارہ ہائے نمائندگان) پیدا کیے ہیں اور اس کو دُنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔ انگلستان کی شفقت اور مہربانی سے سب سے بڑا فائدہ جو ہندوستان کو پہنچ سکتا ہے وہ نمائندہ اداروں کے ذریعے حکومتِ خود اختیاری (لوکل سیلف گورنمنٹ) کے اُصول کا سبق ہے مگر انگلستان میں لاگو اس اُصول کی روشنی میں ہندوستان کے اندر نمائندہ ادارے قائم کرتے وقت یہ اُمر انتہائی اہمیت کا حامل بلکہ اشد ضروری ہے کہ ان سماجی اور سیاسی امور کو مدِنظر رکھا جائے جن میں ہندوستان کی صورتِ حال انگلستان سے مختلف ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور سماجی صورتِ حال صدیوں کے آمرانہ جبر اور ناگزیر تاریخی پس منظر کا نتیجہ ہے۔ یہاں ایک نسل دوسری نسل پر اور ایک مذہب دوسرے مذہب پر زبردستی غالب رہا ہے لوگوں کی روایات، رسم و رواج اور جذبات واحساسات اور ان کا موجودہ سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر اور ان کے مختلف طبقوں کی معاشی حالت تاریخ کے اسی جبر کی پیداوار ہے۔ انگریزوں کی آمد سے جو نئی روشنی آئی ہے اور خالص انسانی نقطۂ نظر سے انگریزوں نے جو حکومت کا انتظام و انصرام کر رکھا ہے اور عدل و انصاف کی کوششیں جو انہوں نے کی ہیں اس سے ابھی تک ہندوستانی معاشرے کی اس صورتِ حال میں کوئی خاص فرق

نہیں پڑا۔ حکومتِ برطانیہ کے زیرِ اثر جو امن و امان یہاں قائم ہوا ہے وہ تو محض زمانۂ حال کی بات ہے ہندوستان کے باشندوں کے مختلف طبقوں کے درمیان صدیوں کی جو دشمنیاں اور نفرتیں تھیں وہ جوں کی توں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان تو ایک برِ اعظم ہے جہاں مختلف نسلوں اور مختلف مذاہب کے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ مذہبی اختلافات نے پڑوسیوں کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہے۔ ذات پات کی عصبیت بڑی طاقتور اور موثر ہے۔ ایک ہی ضلع میں آبادی کا ایک طبقہ دولت اور تجارت میں آگے ہے تو دوسرا علم و فضل اور اثر و رسوخ میں ممتاز ہے کہیں کسی طبقے کی تعداد زیادہ ہے کہیں کسی دوسرے کی۔ کسی طبقے میں سیاسی شعور موجود ہے وہ مقامی لوکل کونسلوں میں اپنی نمائندگی کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہے جب کہ آبادی کا دوسرا طبقہ سرے سے کوئی شعور ہی نہیں رکھتا۔ اس طرح کے حالات میں اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ مقامی اداروں میں نمائندگی کے اُصول پر عمل درآمد مشکلات پیدا کرے گا اور سیاسی اور سماجی تنازعوں اور مسائل کو جنم دے گا۔ انگلستان کی بات اور ہے وہاں نہ نسلی منافرت ہے نہ مذہبی اختلافات کی شدت۔ وہاں مختلف طبقوں میں جو قوتِ برداشت پیدا ہو چکی ہے اس سے مذہبی فرقہ بندیوں کی مخالفتیں بڑی حد تک کم ہو گئی ہیں۔ نسلی یگانگت اور مذہبی ہم آہنگی نے انگلستان کو ایک قوم بنا دیا ہے اور تعلیم کے فروغ و ارتقا نے چھوٹے اختلافات کے منفی اثرات کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ جہاں تک ملکی مفاد کا تعلق ہے سارے انگریز ایک طرح کی سوچ رکھتے ہیں۔ وہاں کسی جگہ اگر کوئی یہودی عیسائیوں کی نمائندگی کرنے لگے تو عیسائیوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر سے انگلینڈ کے باشندے گویا ایک ہی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ہندوستان کے بارے میں اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ انتخاب کے ذریعے نمائندگی سے مراد اکثریت کے نظریات اور مفادات کی نمائندگی ہے ایسے ممالک جہاں کے

لوگ ایک نسل اور ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں وہاں بلاشبہ یہی بہترین طریقہ کار ہے۔لیکن جناب والا ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ابھی تک ذات پات کی اُونچ نیچ اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ موجود ہے، جہاں مذہبی اختلافات انتہائی شدید ہیں، جہاں آبادی کے مختلف طبقوں میں تعلیم کی اشاعت اور فروغ یکساں نہیں ہے وہاں لوکل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں میں خالص اور سیدھے سادے انتخاب کے ذریعے نمائندگی، ایسے گھمبیر مسائل کو جنم دے گی، جن کی نوعیت محض معاشی نہیں ہوگی۔ جو جماعت تعداد میں زیادہ ہے وہ اپنے سے کم تر تعداد والی جماعت کے مفادات کو کچل کر رکھ دے گی جس سے نسلی اور مذہبی منافرت خطرناک حد تک شدید ہو جائے گی اور لوگ اس صورت حال کی ذمہ داری حکومت پر ڈالیں گے۔،،[75]

سرسیّد احمد خان کی اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے ذہن میں ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے بارے میں کوئی ابہام نہ تھا۔وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ سیاست کو مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک انتخابات کے ذریعے اکثریتی پارٹی کا سیاسی غلبہ مسلمانوں پر ہندو قوم کا غلبہ تھا۔وہ ان دونوں قوموں کے مفادات کو باہم متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم سمجھتے تھے۔

1883ء میں سرسیّد احمد خان نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں بھیجنے کے لیۓ ایک فنڈ قائم ہو،سول سروس کا امتحان لندن میں ہوتا تھا۔تجویز یہ تھی کہ ایک یا دو مسلمان امیدواروں کو منتخب کر کے ہر سال اس امتحان میں شرکت کے لیۓ لندن بھیجا جائے اور ان کا سفر خرچ اور وہاں لندن میں قیام وطعام کے اخراجات ایسوسی ایشن اپنے فنڈ سے ادا کرے۔اس مقصد کے لئے امیدواروں کو تیار کرنے کے لیۓ علی گڑھ کالج میں خصوصی کلاس بھی کھولی گئی۔

اسی دوران جب سرسیّد احمد خان مجلسِ قانون ساز کے رُکن تھے وائسرائے لارڈ لٹن نے ان کو ایجوکیشن کمیشن کا ممبر نامزد کیا۔کچھ عرصہ بعد کمیشن کے طریق کار سے اختلاف پر سرسیّد کمیشن سے مستعفی ہو گئے تو ان کی جگہ ان کے بیٹے سیّد محمود کو ممبر بنا دیا گیا۔جس مختصر عرصہ میں سرسیّد نے کمیشن کے ممبر کے

طور پر کام کیا، وہ برابر کمیشن کو اپنے مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔ اس سوال پر کہ کیا مغربی تعلیم دیسی زبانوں میں دی جانی چاہیئے یا انگریزی میں، سرسیّد نے فرمایا:-

> ''ہندوستان میں جو زبان حکمران ہے وہ ورنیکلر نہیں ہے، بلکہ انگریزی زبان ہے اس لیے اس ملک میں ورنیکلر (یعنی دیسی زبانوں) کے ذریعے سے کسی علم کو ترقی نہیں دی جاسکتی۔ تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔''[76]

اعلیٰ جماعتوں کے نصاب کے بارے میں سرسیّد کی رائے یہ تھی کہ کسی ایک علم کو کامل طور پر سیکھنا اس سے کہیں زیادہ بہتر اور مفید ہے کہ بہت سے علوم کو محض سطحی طور پر جانا جائے۔ تعلیم کی توسیع واشاعت اور اس میں اعلیٰ معیار کے حصول کے بارے میں سرسیّد کا خیال یہ تھا کہ جب تک لوگ اپنی تعلیم کا انتظام وانصرام خود اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے اس وقت تک تعلیم کی توسیع واشاعت جیسی کہ ہندوستان جیسے کثیر آبادی کے ملک میں ہونی چاہیئے، نہیں ہو سکے گی۔ انہوں نے اس بات پر بڑا زور دیا کہ جو لائق طلبہ اپنی تعلیم خاطر خواہ طور پر جاری رکھ سکنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں ان کو وظائف دیئے جائیں۔ سرسیّد نے اس صورت حال پر احتجاج کیا کہ یورپین لوگ مشنری سکولوں کو تو بڑی فراخدلی اور منظم طریقے سے مالی امداد دیتے ہیں مگر لوگوں نے پرائیویٹ طور پر جو تعلیمی ادارے قائم کر رکھے ہیں ان کو نہ حکومت کوئی گرانٹ دیتی ہے نہ انگریز ہی اپنی جیب سے کچھ دیتے ہیں۔ پھر جن اسٹیشنوں پر مشنری سکول ہیں وہاں حکومت گورنمنٹ سکول قائم کرنے میں لیت ولعل سے کام لیتی ہے۔ تعلیمِ نسواں کے بارے میں سرسیّد کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کی عورتوں میں اس وقت تک تعلیم عام نہیں ہو سکتی جب تک پہلے مردوں میں تعلیم عام نہ ہو اور ان میں عورتوں کو تعلیم دینے کا احساس پیدا نہ ہو۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

مسلمانوں میں قومی شعور کو بیدار کرنے، ان میں قومی یگانگت اور یک جہتی کے جذبات کو فروغ دینے، تعلیم اور قومی ترقی کی جانب ان کو راغب کرنے کے لیئے 1886ء میں سرسیّد نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ سرسید کا یہ اقدام بڑے دُوررس نتائج کا حامل تھا۔ علی گڑھ میں جب محمڈن کالج قائم ہو گیا اور ملک کے ہر حصے سے مسلمان طلباء نے آکر اس کالج میں داخلہ لے لیا تو گویا تعلیم و ترقی کے لیئے سوچنے اور اس سلسلے میں عملی کوششوں کی ضرورت کا خیال کرنے والے باشعور مسلمانوں کو ایک مرکز مل گیا جہاں سے وہ اپنی قومی سرگرمیوں کے لیئے تحریک حاصل کر سکتے تھے اور جس کی طرف وہ راہ نمائی اور تعاون کے لیئے رجوع کر سکتے تھے۔ یہ گویا ایک ایسا منارۂ نور تھا جس کی روشنی میں وہ اپنی سمت کا تعین کر سکتے تھے مگر سرسیّد نے علی گڑھ کالج کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیئے کافی نہ سمجھا اس مرکز سے پھوٹنے والی کرنوں کو دُور دُور تک پھیلانے اور سارے ملک میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش میں سرسیّد نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا منصوبہ بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے متوازی مسلمانوں کی ایک قومی تنظیم بنانا چاہتے تھے۔ اس کانفرنس کا پہلا اجلاس 27 دسمبر 1886ء کو علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ بظاہر اس کانفرنس کے سامنے اوّلاً جو مقاصد رکھے گئے ان میں مسلمانوں کے اندر جدید اور اعلیٰ تعلیم کا فروغ، حکومت کے قائم کیئے ہوئے سکولوں میں موزوں مذہبی تعلیم کا اہتمام، مشرقی علوم اور دینیات کے نجی تعلیمی اداروں کی سرپرستی اور اصلاح، مکتبوں اور مسجدوں میں قرآن خوانی اور حفظِ قرآن کے اہتمام کو تقویت پہنچانا شامل تھے، مگر ملک کے ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ذیلی کمیٹیاں قائم کرنے کی جو تجویز اس پہلے اجلاس میں منظور ہوئی ان کے فرائض میں ہر قسم کے مدارس اور مکاتب کے متعلق ہی نہیں بلکہ صنعت و حرفت، تجارت، زراعت وغیرہ کے حالات جو مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہوں، کے بارے میں کانفرنس کے مرکزی دفتر کو رپورٹیں بھیجنا بھی

شامل تھا اور جو تجویزیں ان متفرق موضوعات پر کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں منظور کی جائیں ہر کمیٹی کا یہ فرض تھا کہ ان میں سے جو تجویز اس کے علاقے میں قابلِ عمل ہو اس پر عملدرآمد کی کوشش کرے اور اپنی کوششوں کے نتائج سے مرکزی دفتر کو آگاہ رکھے۔ مقامی اسلامی انجمنوں کو اِن کمیٹیوں کا حصہ بنا دیا گیا اور ہر جگہ کے سربرآوردہ اشخاص سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس طرح محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دراصل مسلمانانِ ہند کی ایک ملک گیر ہمہ پہلو اور ہمہ جہت تنظیم بن گئی، جو ہر شعبہ زندگی میں مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے لیئے اجتماعی شعور اور کوششوں کو بروئے کار لانے کے لیئے سرسیّد نے قائم کی تھی۔ ہر سال اس کا اجلاس ایک نئے شہر میں منعقد کرنا طے پایا۔ سرسیّد کی زندگی میں اس کے کُل گیارہ اجلاس ہوئے۔ ہر جلسے کی مکمل کارروائی ایک کتاب کی صورت میں چھپتی اور ممبروں میں تقسیم کی جاتی۔ سرسیّد اس کانفرنس کے سیکرٹری اور وہی دراصل اس کے رُوحِ رواں تھے۔ انہوں نے جس محنت اور مستقل مزاجی سے اس کانفرنس کی ساری کارروائیوں میں دلچسپی لی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عملی طور پر مسلمانوں کی ایک ملک گیر جماعت کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ حاؔلی لکھتے ہیں کہ جس شہر میں کانفرنس کے سالانہ اجلاس کا انعقاد طے پاتا سرسیّد کئی دن پہلے وہاں پہنچ جاتے اور کانفرنس کی مقامی کمیٹی کی راہنمائی کرتے۔ جس ہال میں اجلاس ہوتا اُس میں نشستوں کے اہتمام اور اس کی تزئین و آرائش کی جزئیات تک کی نگرانی کرتے، مندوبین کے قیام و طعام کا بندوبست کرتے۔ ہر اجلاس میں جو مختلف اہم شہروں میں منعقد ہوتے ان میں ملک کے کونے کونے سے مسلمانوں کی نمائندہ شخصیتیں شریک ہوئیں۔ کئی دفعہ مندوبین کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کر گئی۔ یہ لوگ بقول حاؔلی:

> ''نہ کسی سیر اور تماشے کی غرض سے، نہ کسی حاکم کے حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لیئے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے ارادہ سے ہوتا ہے اس میں شریک ہوں، دُور دراز سفر کی تکلیف اور آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے، ایک جگہ کھانا کھاتے تھے، ایک جگہ رہتے تھے، قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے، ہنستے تھے، بولتے تھے۔ انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا۔ دوستوں میں خلوص بڑھتا تھا اور اس طرح ایک مردہ اور پراگندہ قوم کے اجزاء

میں روز بروز التیام پیدا ہوتا جاتا تھا...... خصوصاً جس شہر میں کانفرنس کا اجلاس ہوتا تھا وہاں کے باشندوں پر بالخصوص اس کا اور بھی زیادہ اثر پڑتا تھا۔''[77]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے فوری طور پر جو فوائد مسلمانوں کو پہنچے ان میں سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہوا اور یہی اس کا اصل مقصد تھا کہ ایک ملک گیر تنظیم وجود میں آ گئی اور مسلمانوں کے باشعور طبقے کو مل بیٹھنے اور اپنے مسائل پر غور و خوض کرنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ یہی کانفرنس آگے چل کر مسلم لیگ کے سانچے میں ڈھلی۔ کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ڈھاکہ کے مندوبین نے ہی نواب سلیم اللہ خاں کی کوٹھی میں جمع ہو کر مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا۔ بہر حال چھوٹے بڑے متعدد فائدے کانفرنس کے ابتدائی سالوں میں سامنے آنا شروع ہو گئے۔ کانفرنس نے غریب طلباء کی امداد کے لیئے وظائف کا اہتمام کیا۔ اس کے لیئے چندہ جمع کرنے کی علیحدہ مہم کا آغاز ہوا۔ پنجاب کی اکثر اسلامی انجمنوں میں طلباء کی مالی امداد کی تحریک پیدا ہوئی۔ مختلف موضوعات پر کئی عمدہ رسالے لکھے گئے۔ کانفرنس کے ہر اجلاس پر جو تقاریر کی جاتیں انہیں الگ کتاب کی صورت میں شائع کیا جاتا۔ کانفرنس میں ہر اجلاس میں پیش کی گئی تجاویز کی روشنی میں اہلِ قلم نے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الزمیتین، مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب، ابوریحان البیرونی کی سوانح اور اشاعت اسلام جیسے موضوعات پر رسالے اور کتابیں لکھیں۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد، نواب محسن الملک سید مہدی علی خان اور سید محمود کے لیکچرز اور تقاریر کے مجموعے شائع کیے گئے۔ کانفرنس کی تحریک اور کوششوں سے الہ آباد یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کاکس ہسٹری کو جس میں مسلمانوں کی توہین کے مضامین تھے، نصاب سے خارج کیا گیا۔ ہندوؤں کے زیرِ اثر فارسی زبان کو یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کرنے کی جو تجویز ہو رہی تھی اس کو رد کا گیا۔ اس کانفرنس کی قرار داد کی بنیاد پر نواب محسن الملک نے سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا اہتمام کرنے کی تحریک اٹھائی۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اضلاع شمال مغرب میں اس کی اجازت دے دی۔ 1892ء میں بمقام دہلی کانفرنس کا جو سالانہ اجلاس منعقد ہوا محمڈن علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بک کی تحریک پر تعلیمی مردم شماری کی تجویز سامنے آئی۔ جس کا مقصد اس اَمر کا جائزہ لینا تھا کہ عموماً مسلمان اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم کیوں نہیں دلواتے؟ ان کی تعداد کیا ہے؟ ان کے اس روّیے کے اسباب اور وجوہات کیا ہیں؟ کیا مذہبی خیالات مانع ہیں؟ یا غربت اور ناداری کی وجہ سے

وہ اپنی اولاد کو سکولوں میں نہیں بھیجتے یا اس کی وجہ محض ان کی لاپرواہی اور سہل انگاری ہے۔ اس اُمر کا جائزہ لینا بھی مقصود تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

1897ء اور 1898ء میں جب ناسازیٔ طبع اور بیماری کی وجہ سے سرسید اتنے سرگرم نہ رہے جتنے وہ پہلے تھے تو ایجوکیشنل کانفرنس کی ساری ذمہ داری ان کے دستِ راست نواب محسن الملک نے سنبھال لی۔ سرسیّد کی وفات کے بعد زندہ دلانِ پنجاب نے لاہور میں کانفرنس کے انعقاد کا جو شاندار انتظام کیا وہ نواب محسن الملک سیّد مہدی علی خان کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس باقاعدگی سے ہر سال مختلف شہروں میں منعقد ہوتے رہے اور وہ مسلمانوں کی راہنمائی کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کرتی رہی۔ پنجاب میں نچلی سطح پر اُردو سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ مگر ہندوؤں کی خواہش تھی کہ اُردو کی بجائے پنجابی کا استعمال ہو۔ وہ کہتے تھے چونکہ پنجابی اہلِ پنجاب کی روزمرہ کی بول چال کی زبان ہے اس لیے یہی نہ صرف تھانوں اور کچہریوں میں بولی جانی چاہیئے بلکہ پنجاب یونیورسٹی میں بھی اُردو کی جگہ پنجابی کو ملنی چاہیئے۔ ڈاکٹر پی سی چیٹر جی اس مقصد کے لئے بڑھ چڑھ کر کوشش کر رہا تھا۔ اس نے 1909ء میں پنجاب یونیورسٹی میں منعقدہ ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے باقاعدہ مطالبہ کر دیا کہ یونیورسٹی میں ہر سطح پر جہاں اُردو کا استعمال ہو رہا ہے اس کی جگہ پنجابی کا استعمال ہونا چاہیئے۔ اصل بات یہ تھی کہ ہندو اُردو کو مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی علامت سمجھتے تھے اور اسی لئے وہ 1837ء سے برابر اس کوشش میں تھے کہ اُردو کا چلن کسی نہ کسی طرح ختم ہو۔ یوپی اور بہار میں وہ ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو آگے لانا چاہتے تھے۔ پنجاب میں پنجابی زبان کا نعرہ بلند کر رہے تھے مگر مسلمانوں نے ہر موقع پر ان کوششوں کا سدِ باب کیا۔ اہلِ پنجاب، ڈاکٹر چیٹر جی اور اس کے ساتھیوں کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لئے پہلے ہی کمربستہ ہو چکے تھے۔ 1890ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس میاں محمد شفیع کی صدارت میں امرتسر کے مقام پر ہوا اس میں متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی گئی کہ نہ صرف دفتروں، سکولوں اور پنجاب یونیورسٹی میں جہاں جہاں اُردو استعمال ہو رہی ہے اس کے استعمال کو جاری رکھا جائے بلکہ اسے فروغ دیا جائے۔ قرارداد میں کہا گیا کہ ہر چند کہ پنجابی اہلِ پنجاب کی مادری زبان ہے مگر وہ اس قابل نہیں کہ دفتروں میں استعمال ہو یا اسے ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

سرسیّد اور انڈین نیشنل کانگرس

1887ء میں وائسرائے لارڈ ڈفرن نے سرسیّد کو پبلک سروس کمیشن کا ممبر نامزد کیا اور وہ چند سال اس حیثیت میں کام کرتے رہے۔ انہیں کمیشن کے اجلاس میں شرکت کے لیئے اکثر کلکتہ اور دوسرے بڑے شہروں کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ علی گڑھ میں ان کی مصروفیات اتنی بڑھ چکی تھیں کہ پبلک سروس کمیشن کے اجلاس میں شرکت کے لئے وقت نکالنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ کالج کی روزمرہ نگرانی کے علاوہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی مصروفیات، علی گڑھ گزٹ کی ادارت، تفسیر القرآن کے سلسلے میں وسیع مطالعہ اور تحقیق و تحریر کا کام اُنہیں دِن رات مصروف رکھتا تھا۔ رات کے ایک دو بجے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے نمازِ فجر کے بعد اُن کے دِن کا آغاز ہو جاتا۔ انہوں نے سروس کمیشن کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ مجلسِ قانون ساز کی رُکنیت اور ایجوکیشن کمیشن کی ممبری سے وہ پہلے ہی مستعفی ہو چکے تھے۔

1885ء میں انڈین نیشنل کانگرس بن چکی تھی۔ سرسیّد نے دو سال تک اس کے موافق یا مخالف کسی رائے کا اظہار نہ کیا وہ اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہے۔ سرسیّد 1867ء تک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ترقی و بہبود کے لیئے تدبیریں سوچتے رہے اور جو پروگرام بھی ان کے ذہن میں آتا تھا وہ دونوں کی بھلائی کا برابر خیال رکھتے تھے۔ دونوں قوموں میں ہم آہنگی اور دوستی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیئے وہ اس حد تک چلے گئے تھے کہ مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے سے منع کرتے تھے تا کہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں۔ حاؔلی لکھتے ہیں:

> ''ہمیشہ اِن کی یہ رائے رہی کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم ہے تو یہ دوستی ہمارے لئے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔''[78]

مگر 1867ء میں جب بنارس کے ہندوؤں نے اُردو کی جگہ ہندی نافذ کرنے کی تحریک کا آغاز

بڑے زور و شور بلکہ ہٹ دھرمی سے کر دیا تو وہ ہندوؤں کی اس متعصبانہ غیر منطقی اور نا معقول روش پر دل برداشتہ ہو گئے۔ ان دونوں قوموں میں دوستی اور خیر سگالی کے سچے جذبات کی نشو و نما کی انہیں کوئی اُمید نہ رہی۔ اس بارے میں کمشنر بنارس مسٹر شیکسپیئر سے ان کی گفتگو کا بیان پہلے آچکا ہے۔ اس کے بعد مختلف مواقع پر عام ہندو افسروں اور اہلکاروں کا جو روّیہ انہوں نے دیکھا، خاص کر جس انداز میں بنگلہ ہندو اخبارات میں مسلمانوں کے خلاف مضامین کا جو سلسلہ چل نکلا تھا اس سے ہندوؤں سے کسی اچھائی کی رہی سہی اُمید بھی ان کے دِل سے جاتی رہی۔ انہیں اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ ہندوؤں کی ساری سرگرمیاں اور اُن کی تمام اجتماعی سوچیں مسلمانوں کو کمزور کرنے اور اُن کے مفادات کو نقصان پہنچانے پر مرکوز ہیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ سرکاری محکموں میں ہر طرف ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ان کے زیرِ اثر سرکاری سکولوں میں تاریخ کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اس میں مسلمان بادشاہوں کے حالات و واقعات کو مسخ کر کے اور توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ ان کتابوں کو پڑھ کر ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ مسلمانوں کے سخت خلاف ہوتا جا رہا تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس نے جب انگلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی سول سروس کے مقابلے کے امتحانات کے انعقاد کا مطالبہ کیا اور اس کے لیڈر دوسرے ماتحت عہدوں پر بھی اہلکاروں کی تقرری کے لئے صرف مقابلے کے امتحان کو بنیاد بنانے کی تدبیریں کرنے لگے اور اُنہوں نے وائسرائے کی مجلس قانون ساز اور کلکتہ اور بمبئی کی میونسپل کارپوریشنوں میں نامزدگیوں کے بجائے ووٹوں سے ممبروں کے چناؤ پر زور دیا تو سر سیّد احمد خان ان تمام مطالبات اور کوششوں کو مسلمانوں کے مفادات کے صریحاً خلاف سمجھتے ہوئے کانگرس کی مخالفت پر تُل گئے۔ 28 دسمبر 1887ء کو لکھنؤ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔ ''اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہو گا تو چار ہندو ہوں گے اور اگر بالفرض محال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جس کی رُو سے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے ممبر برابر ہوں تو موجودہ حالت میں ایک بھی مسلمان ایسا نہیں نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو۔''[79]

مقابلہ کے امتحان کی نسبت بھی انہوں نے اسی طرح کے خدشات کا اظہار کیا کہ تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمام عہدے ہندو لے جائیں گے۔ انہوں نے کہا:

''مقابلہ کا امتحان اس ملک میں ہوسکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں...... پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت اس قدر مختلف اور متضاد ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ اور جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلہ کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔''

سرسید نے 16 مارچ 1888ء کو میرٹھ کے مقام پر مسلمانوں کے ایک عام جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اس سے بھی زیادہ وضاحت سے اور سخت الفاظ میں کانگرس کے منصوبوں کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ کانگرس صرف اور صرف ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کانگرس نے اخبارات اور رسائل میں اپنے بیانات سے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ مسلمان بھی کانگرس میں شریکہیں تو یہ بالکل غلط ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو کانگرس سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین کی۔ سرسید اس بارے میں لکھتے ہیں:

''جب کہ انڈین نیشنل کانگرس نے اوّل اوّل شور وغل کیا تو میں نے اپنی پبلک اسپیچوں میں اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو یہ صلاح دی کہ کانگرس کی اس خطرناک اور اس لئے غیر وفادار اور گمراہ کرنے والی اور دھوکہ دینے والی تحریک سے بالکل الگ رہیں۔''...... اس طرح ہندوؤں کی قوم کلہم اجمعین میرے خون کی پیاسی ہوگئی۔''[80]

کانگرس سے سرسیّد احمد خان کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں ہندو مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر شاطرانہ چالوں سے انہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال نہ کریں۔ کانگرس اپنے مطالبات کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ بنگالی ہندو پریس حکومت کے خلاف مسلسل لکھ رہا تھا۔ سرسیّد کو پریشانی تھی کہ کہیں ان مطالبات اور نکتہ چینیوں کا زور عملی ایجی ٹیشن کا رُوپ نہ دھار لے اور حکومت کے خلاف کوئی سیاسی تحریک نہ اُٹھ کھڑی ہو۔ ایسی صورت میں کانگرس کی ہندو قیادت سادہ لوح مسلمانوں کو آگے کر دے گی اور حکومت جب کسی ایسی تحریک کو دبانا چاہے گی تو اس کا نزلہ مسلمانوں پر گرے گا۔ بمبئی کی معروف سماجی شخصیت بدرالدین طیب جی کو ایک خط میں یہی بات سمجھاتے ہوئے سرسیّد لکھتے ہیں ''غدر میں کیا ہوا ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔''[81] ہندوؤں کی یہ کوشش تھی کہ کانگرس میں زیادہ سے

زیادہ مسلمانوں کو شامل کیا جائے وہ یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ کانگرس سارے ہندوستانی باشندوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس تاثر کو تقویت دینے کے لیئے کانگرس کے اجلاس منعقدہ دسمبر 1887ء بمقام مدراس کی صدارت بمبئی کی معزز اور معروف سماجی شخصیت بدرالدین طیب جی کو پیش کی گئی، بالکل اسی طرح جیسے بیسویں صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگرس کا صدر بنایا گیا۔ سرسیّد نے کانگرس کی اس چال کا باقاعدہ نوٹس لیا اور 28 جنوری 1888ء کو بدرالدین طیب جی کو حسب ذیل خط لکھا۔ '' آپ نے کانگرس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہندو ہم وطن اس پر بڑے خوش ہوئے ہیں مگر جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اس سے دُکھ ہوا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ جو الفاظ ہیں نیشنل کانگرس، ان سے کیا مراد ہے کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب، مختلف ذاتوں اور برادریوں کے جو لوگ بس رہے ہیں وہ ایک قوم ہیں یا ایک قوم بن سکتے ہیں اور ان کے مقاصد اور آرزوئیں ایک ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل ناممکن ہے اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگرس قسم کی کسی چیز کا وجود بھی ممکن نہیں اور نہ یہ سب لوگوں کے لیئے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ ''[82]

انڈین نیشنل کانگرس کے اس بے بنیاد پروپیگنڈے کے توڑ کے طور پر کہ کانگرس سارے ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ سرسیّد نے اگست 1888ء میں علی گڑھ میں انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی تاکہ جو قومیں اور جو تعلقہ دار اور جو رئیس کانگرس میں شریک نہیں ہیں ان کو اس ایسوسی ایشن میں شامل کیا جائے اور ان کی آراء اور ان کے خیالات و مطالبات سے حکومت کو اور اہلِ انگلستان کو اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبران کو آگاہ اور باخبر رکھا جائے اور اس مقصد کے لیئے یادداشتیں اور پمفلٹ انگلستان بھیجے جائیں اور اخبارات میں شائع کیئے جائیں۔ سرسیّد احمد خان کے اپنے الفاظ میں '' کانگرس کے خلاف ہندوؤں نے اور مسلمانوں نے جو آوازیں اُٹھائی ہیں اس کا ہندوستان کے سرکاری افسروں اور عوام کو علم ہے لیکن کانگرس کے حامی غلط طریقے اختیار کر کے انگلستان میں لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے تمام باشندے ہندو اور مسلمان سب کانگرس کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ انگلستان کے لوگوں کو ہم حقیقت سے باخبر کریں کہ مسلمان اور بہت سے بااثر اور صاحب اقتدار ہندو بھی کانگرس کے مخالف ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ جو ہندو اور مسلمان کانگرس کے خلاف ہیں ان کی ایک ایسوسی ایشن بنائی جائے اس کا نام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ

اگر کوئی انگریز ایسوسی ایشن کا ممبر بننا پسند کرے تو ہم اس کی اعانت کے انتہائی ممنون ہوں گے...... ممبری کے خواہاں اصحاب اپنے نام یا تو منشی امتیاز علی یا منشی نول کشور لکھنؤ یا راجہ شیو پرشاد بنارس یا سیّد ظہور حسین وکیل ہائی کورٹ الہ آباد یا مسٹر تھیوڈور بیک پرنسپل محمڈن کالج علی گڑھ یا راقم کے نام بھیج دیں۔"[83]

اس ایسوسی ایشن کے بننے پر اور سرسیّد کی تحریک سے بنگال، بہار، مدراس، بمبئی ممالک متوسطہ (سی پی) اضلاع شمال مغربی اور اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں نے کانگرس کے خلاف جلسے منعقد کئے۔ تمام تعلقہ دارانِ اودھ، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدرآباد اور کئی دیگر ریاستوں کی طرف سے اس ایسوسی ایشن کے اغراض ومقاصد کی حمایت کی گئی۔

اس ایسوسی ایشن میں کچھ معروف ہندو اور انگریز بھی شامل ہوئے۔ مگر سرسیّد نے بطورِ خاص مسلمان رہنماؤں کو اس کی رُکنیت پر مائل کرنے کوشش کی۔ جامع مسجد دہلی کے امام سیّد محمد بخاری کے نام 25 اگست 1888ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "جو ایسوسی ایشن برخلاف ہندوؤں کے ہم نے قائم کی ہے اس میں تمہارا شریک ہونا نہایت ضروری اور مناسب ہے۔"[84]

سرسیّد کرنل گراہم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "میں نے نام نہاد کانگرس کے خلاف ایک بہت بڑے کام کا بیڑہ اٹھایا ہے اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی جس کا کام دوسرے کاموں کی نسبت بدرجہا زیادہ ہے۔"[85]

سرسیّد نے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی تمام تنظیموں کو اور متعدد شہروں میں جو اسلامی انجمنیں قائم تھیں سب کو کانگرس کے خلاف متحرک کر دیا۔ کانگرس کے خلاف دھڑا دھڑ قراردادیں پاس ہو ہو کر آنے لگیں۔ اخباروں میں بیانات اور خطوط چھپنے لگے۔ اس پر ہندو پریس نے سرسیّد کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ خصوصاً بنگالی ہندو اخبارات ورسائل نے ان پر بڑھ چڑھ کر حملے کیئے اور بڑے تلخ مضامین لکھے۔ مگر سرسیّد نے کسی مخالفت کی پرواہ نہ کی اور جس کام کو مسلمانوں اور اپنے ہم وطنوں کے لیئے مفید اور بہتر سمجھا اس کی بجا آوری میں تن من دھن سے لگے رہے۔ کانگرس کے خلاف سرسیّد کی مہم کے اس سلسلے کے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلمان جو عموماً سرسیّد کے ہر منصوبے اور ہر اقدام کی مخالفت کرتے رہتے تھے، اس مہم میں سرسیّد کے ہمنوا بن گئے۔ وہ کانگرس کے بارے میں ان

کی حکمتِ عملی کی تعریف وتحسین میں رطب اللسان تھے۔ تمام اسلامی انجمنیں اور اکثر دینی اور مذہبی حلقے سرسیّد کی تائید وحمایت کرنے لگے۔ البتہ کانگرس کے ایما پر کانگرس سے ہمدردی رکھنے والے کچھ مسلمانوں نے سرسیّد کی مخالفانہ تحریک کے توڑ کے لئے علمائے ہند سے رُجوع کیا اور ان سے ایک فتویٰ حاصل کیا جس میں حکومت سے مراعات مانگنے کی غرض سے کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کی ترغیب دی گئی تھی اور سرسیّد کے افکار وخیالات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اور انہیں نیچری اور منکرِ نصوص قرآن و احادیثِ نبوی ؐ قرار دیتے ہوئے مسلمانوں سے کہا گیا کہ ''اس کے شریک مت ہونا۔''[86] گویا سرسیّد کے بارے میں اس وقت علمائے ہند نے وہی روّیہ اپنایا جو بعد میں قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ کے بارے میں عمومی طور پر اختیار کیا اور عامۃ المسلمین نے اس موقع پر سرسیّد کی جو حمایت کی وہ بھی اس حمایت وتائید کے مشابہ ہے جو قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ کو حاصل ہوئی۔

1890ء کے آغاز میں سیاسی مصروفیات نے سرسیّد کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کرلیا اور وہ کانگرس کے خلاف ازسرِنو سرگرم ہو گئے وہ لکھنؤ اور میرٹھ میں اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو اور دوسرے پس ماندہ طبقوں کو انڈین نیشنل کانگرس سے خبردار کر چکے تھے۔ خاص طور پر مسلمانوں کو انہوں نے تنبیہ کی تھی کہ وہ کانگرس سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھیں۔ اس دوران کانگرس لوکل کونسلوں میں نامزدگیوں کی جگہ اراکین کے انتخاب پر زور دیتی رہی اور اپنے اس مطالبے کو بھی بڑھ چڑھ کر پیش کرتی رہی کہ تمام نوکریاں مقابلے کے امتحان کے ذریعے دی جائیں۔ سرسیّد ان دونوں مطالبات کو مسلمانوں کے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے وہ برابر ان کی مخالفت میں آواز اٹھاتے رہے۔ اس خیال سے کہ حکومت سرسیّد کی آواز کو اکلوتی آواز نہ سمجھ بیٹھے۔ انہوں نے مسلمانانِ ہند کی طرف سے برطانوی دارالعوام (ہاؤس آف کامنز) کے اراکین کو ایک یاداشت اس مضمون کی دینے کا پروگرام بنایا کہ مسلمان کانگرس کے ان مطالبات کے خلاف ہیں۔ سرسیّد اس پروپیگنڈے کا توڑ بھی ضروری سمجھتے تھے جو کانگرس انگلستان میں یہ تاثر دینے کے لئے زور وشور سے کر رہی تھی کہ وہ سارے ہندوستانیوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور یہ کہ وہ جو مطالبات کر رہی ہے وہ ہندوستان کے تمام طبقوں کی خواہش پر کر رہی ہے۔ اُدھر لندن سے یہ خبریں آرہی تھیں کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانی کونسلوں سے متعلق ایک نیا مسودۂ قانون پیش کیا جارہا ہے۔ چنانچہ سرسیّد نے اس مقصد کے لئے ایک یاداشت تیار کی۔ ہندوستان کے 70 شہروں کے چالیس ہزار سربرآوردہ مسلمانوں سے اس پر دستخط کروائے اور اپریل 1890 میں یہ عرضداشت ہاؤس آف

کامنز کے ممبران کو مخاطب کر کے لندن روانہ کی۔ اس کے مندرجات حسب ذیل تھے۔

''برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کی پارلیمنٹ کے معزز اراکین کی خدمت میں ہندوستانی مسلمانوں کی مؤدبانہ عرضداشت۔''

1) ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ انتخاب کے اصول کا نفاذ اس بے لاگ اور غیر جانب دارانہ عدل و انصاف کو تباہ کر دے گا جو اب تک ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیاد رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلمانوں اور مختلف اقلیتی فرقوں کو وہ بااثر اکثریتی طبقہ جو ان کی مخالفت میں سرگرم ہے کچل کر رکھ دے گا۔

2) ہندستانی مسلمان اگرچہ ہندوستان کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں مگر ان کی تعداد پانچ کروڑ ہے۔

3) اپنی تاریخ، روایات، دلیری اور ذہانت کی وجہ سے ہندوستان کی مسلمان قوم ہندوستانی سیاست میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

4) ہم مسلمان چونکہ برِ اعظم ہند کے مختلف حصوں میں متعدد نسلوں اور قوموں کے درمیان بکھرے پڑے ہیں۔ اس لیے کسی بھی انتخابی نظام میں ہم دب کر رہ جائیں گے۔

5) اس سلسلے میں آپ معزز اراکین پارلیمنٹ کو انڈین نیشنل کانگرس کے پروپیگنڈے اور شوروغل سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔

6) متناسب نمائندگی کی کوئی تدبیر بھی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ اس لیئے نہیں کر سکے گی کیونکہ مسلمانوں کے مقابلے میں مختلف نسلوں کے ہندو مجموعی طور پر ایک کے مقابلے میں چار کی اکثریت میں ہیں۔

7) ہم استدعا کرتے ہیں کہ آپ کا معزز ایوان ہندوستانی کونسلوں میں ہر سطح پر نامزدگیوں کے موجودہ نظام کو برقرار رکھے گا۔

سرسیّد کی ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ برطانوی پارلیمنٹ نے 1892ء میں ہندوستانی کونسلوں کا جو

قانون منظور کیا جسے انڈین کونسلز ایکٹ 1892ء کا نام دیا گیا، اس میں انتخابی اصول کا اطلاق نہ کیا۔ مرکزی اور صوبائی سطح پر غیر سرکاری اراکین کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا، غیر سرکاری اراکین کی نامزدگیوں کی بنیاد میونسپل کارپوریشنوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں چیمبرز آف انڈسٹری اینڈ کامرس اور یونیورسٹیوں کی سفارشات پر رکھی گئی۔

1888ء میں سر سیّد کو تاج برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب عطا ہوا۔ علی گڑھ میں ایک عالی شان تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں علی گڑھ کے کلکٹر مسٹر کینیڈی نے ملکہ وکٹوریہ کا فرمان پڑھ کر سنایا اور اہلِ وطن کی بہبود و ترقی کے لیئے سر سیّد کی نمایاں خدمات اور کارناموں پر اور حکومت میں مختلف حیثیتوں سے خدمات کی قابل تقلید و تحسین ادائیگی پر انہیں تمغۂ امتیاز (کے سی ایس آئی) سے نوازا گیا۔ اس خطاب کے ملنے پر سیّد احمد خان، سر سیّد احمد خان ہو گئے۔ 18 اپریل 1889ء کو اڈنبرا یونیورسٹی نے سر سیّد احمد خان کو ایل ایل ڈی یعنی ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری عطا کی۔ یہ ڈگری انگلستان میں اڈنبرا یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر دی گئی۔ سر سیّد تک اس کی اطلاع بعد میں پہنچی۔ اس کارروائی کی ساری تفصیل 28 مئی 1889ء کے علی گڑھ گزٹ میں چھپی۔ انگلستان کے اخبارات نے سر سیّد احمد خان کے بارے میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع کی۔ پروفیسر کرک پیٹرک نے لارڈ چانسلر سے ان الفاظ میں سر سیّد احمد خان کو ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کرنے کی استدعا کی۔ "میں سب سے پہلے آپ سے یہ اجازت چاہتا ہوں کہ سر سیّد احمد خان بہادر کے سی ایس آئی کو ان کی غیر حاضری میں ڈاکٹر آف لاز کی آنریری ڈگری عطا کی جائے۔" سر سیّد کو یہ ڈگری اُن کی غیر معمولی علمی و ادبی خدمات اور قابلِ قدر تصنیفات پر دی گئی۔ خطباتِ احمد یہ کا ذکر بطورِ خاص کیا گیا۔ محمڈن کالج کے قیام کے سلسلے میں ان کی مساعی کو سراہا گیا۔ یہ بھی بیان کیا گیا کہ تحقیق اور علمی خدمات کی بنا پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے پہلے ہی انہیں اپنا فیلو نامزد کیا ہوا ہے۔ سرکاری ملازمت، ایامِ غدر، مجلس قانون ساز کی رُکنیت اور پبلک سروس کمیشن کی ممبری کے دوران ان کی نمایاں کارکردگی کی تعریف کی گئی۔ حالی لکھتے ہیں کہ سر سیّد احمد خان اس اعزاز کے عطا ہونے پر اڈنبرا یونیورسٹی کے شکر گزار تھے مگر اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے وہ اعزازی ڈگری کو ایک طرح کی بھیک ملنے کے مترادف سمجھتے تھے۔

کالج کا بحران

اب تک کالج کا نظم ونسق کالج کی کمیٹی اور اس کی کچھ ذیلی کمیٹیاں چلا رہی تھیں۔ کالج کمیٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے سرسیّد احمد خان ہی ایک طرح سے کالج کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ کالج کے انتظام وانصرام کو مستقل بنیادوں پر استوار کرنے کی غرض سے سرسیّد چاہتے تھے کہ کالج کو ایک ٹرسٹ بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیئے انہوں نے اپنی تجاویز پر مشتمل ایک ٹرسٹی بل تیار کرکے کالج کمیٹی کے ممبران کے جلسۂ عام میں پیش کیا کہ اس پر غور وخوض اور بحث وتمحیص ہو اور کمیٹی اپنی صوابدید پر اس کے بارے میں فیصلہ کرے۔

ٹرسٹی بل کی جو تجاویز سرسیّد نے کالج کمیٹی کے سامنے رکھیں، ان میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ سیّد محمود کو جو اُن کے فرزندِ ارجمند تھے کالج کا جائنٹ سیکرٹری اور سرسیّد کے بعد لائف سیکرٹری مقرر کیا جائے۔ اس تجویز کی تحریک کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بک اور انگریز پروفیسروں نے کی تھی۔ یہ لوگ سیّد محمود کی وجہ سے ہی انگلستان سے آکر علی گڑھ محمڈن کالج میں ملازمت کرنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر سیّد محمود کو ان کے کیمبرج کے دنوں سے جانتے تھے اور ان سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ سرسیّد بھی یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ یورپین سٹاف کو سید محمود پر اعتماد ہے اس لئے سیّد محمود کا سیکرٹری ہونا کالج کے حق میں مفید ہوگا اور ان کے بعد کالج بخیر وخوبی اسی طرح چلتا رہے گا، جس طرح ان کی زندگی میں کام کر رہا ہے۔ اس تجویز میں کسی قسم کی بدنیتی کو ہرگز دخل نہ تھا یہ محض کالج کے مفاد میں ٹرسٹی بل میں شامل کی گئی تھی مگر کالج کمیٹی کے بانی ممبر مولوی سمیع اللہ خان بہادر نے اس تجویز کی اتنے شدومد کے ساتھ مخالفت کی کہ سرسیّد اُن کے ردِعمل پر حیران رہ گئے۔ بہرحال غور وخوض اور بحث وتمحیص کے دوران بل کی کسی تجویز کی موافقت یا مخالفت کرنا نہ صرف ان کا حق تھا بلکہ فرضِ منصبی بھی تھا۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا مگر جب کمیٹی نے کثرتِ رائے سے بل کی منظوری دے دی اور اس میں سیّد محمود کی جائنٹ سیکرٹری شپ کو بھی

منظور کر لیا تو مولوی سمیع اللہ خان کو چاہیئے تھا کہ وہ کمیٹی کے فیصلے کو کھلے دِل سے قبول کر لیتے اور اکثریت کے مؤقف کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے مگر بد قسمتی سے انہوں نے اسے اپنا ذاتی مسئلہ بنا لیا اور سید محمود بلکہ سر سیّد احمد خان کے خلاف پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی اور اس مہم میں کالج کے کئی مقامی اہلکاروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ سر سیّد کو مولوی سمیع اللہ خان کے طرزِ عمل سے سخت صدمہ پہنچا۔ انہوں نے مخالفتوں کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی مگر ایک پرانے ساتھی اور رفیق کار بلکہ ایک عزیز دوست کی ضد اور ہٹ دھرمی نے انہیں اندر سے اس قدر ہلا کر رکھ دیا کہ انہوں نے علی گڑھ گزٹ میں اس بارے میں جو شذرہ لکھا اس میں مولوی سمیع اللہ خان کو فرانس چل کر وہاں کے ملکی قانون کے مطابق ڈوئِل Duel لڑنے کا چیلنج دے دیا۔

حالیؔ لکھتے ہیں کہ اس سانحے کا سر سیّد کے دل پر اس قدر اثر پڑا کہ ان کی طبیعت افسردہ رہنے لگی۔ غالباً سر سیّد کو اتنا صدمہ اس وجہ سے پہنچا کہ مخالفین نے سیّد محمود کو جائنٹ سیکرٹری بنانے کی تجویز پیش کرنے پر ان کو اقرباء نوازی کا طعنہ دیا اور ان کے بارے میں یہ کہا کہ وہ کالج کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں۔

ٹرسٹی بل کے سلسلے میں کالج میں جو شدید اختلافات پیدا ہوئے اور جس طرح سخت تلخی کے عالم میں مولوی سمیع اللہ خان کالج سے لاتعلق ہو گئے اس کا سر سیّد کے دل پر بڑا منفی اثر پڑا۔ حالیؔ لکھتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور چڑ چڑا پن پیدا ہو گیا۔ کالج کے چھوٹے بڑے سٹاف میں مولوی سمیع اللہ خان کے جو حامی تھے وہ کالج میں ایک طرح سے اپنا الگ گروپ بنا کر سازشیں کرنے لگے۔ مختلف جعلی ناموں سے اخبارات میں سر سیّد کے خلاف مضامین لکھے گئے جن میں سر سیّد کی مبینہ آمرانہ ذہنیت اور ہٹ دھرمی کو نشانہ بنایا گیا۔ سیّد محمود کے کردار پر کیچڑ اُچھالا گیا۔ یورپین دوستوں کی صحبت میں ان کی شراب نوشی کے قصے مشہور کیئے گئے۔ کالج کے نہایت وفادار اور محنتی پرنسپل مسٹر تھیوڈور بک کے خلاف زہر اگلا گیا۔ بورڈنگ ہاؤس میں بد نظمی کی شکایت پر سر سیّد نے بورڈنگ ہاؤس کا انتظام بھی پرنسپل کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ پرنسپل نے کچھ طلباء کے خلاف جو ہوسٹل میں غلط قسم کی سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے تھے، کالج کے قواعد کے مطابق انضباطی کارروائی کی۔ اس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ یوں لگتا تھا کہ کالج کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سب کیا دھرا تلپٹ ہو جائے گا۔ سر سیّد پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ بورڈنگ ہاؤس کا چارج پرنسپل سے لے کر کالج کمیٹی کے کسی مسلمان ممبر کے ہاتھ میں دے دیں۔ اس وقت کے حالات اور سر سیّد کے جذبات و احساسات کا اندازہ

ان کی مختلف تحریروں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

''پرنسپل کو بحیثیت پرنسپل، بورڈنگ ہاؤس میں ڈسپلن قائم رکھنے اور قصورات کی نسبت جو سزائیں مقرر ہوں، ان کو دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ہر ایک امر میں اختلاف کرنے کا ارادہ کرلیا ہے، وہ ان صاف صاف باتوں سے بھی اختلاف کرتے ہیں اور رائے دیتے ہیں کہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی بجز مسلمان ممبر کے کسی اور کو نہ دی جائے۔ یورپ میں، ایشیا میں، ہندوستان میں امریکہ میں کہیں کوئی کالج ایسا ہے کہ اُس کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس ہو اور پرنسپل کی بورڈروں پر ایسی ہی حکومت نہ ہو، جیسی کہ اس کالج میں ہے؟ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو جدا سمجھنا ایسا ہے جیسا کہ انسان کو اور اس کی رُوح کو جدا سمجھنا۔''[86]

''مخالفت، رائے سے نہ رہی بلکہ عداوت اور ذاتیات تک نوبت پہنچ گئی۔ رسالے چھپے، اخباروں میں آرٹیکل چھپے، انگریزی میں پمفلٹ چھاپ چھاپ کر ہندوستان میں تقسیم ہوئے اور کوئی درجہ مخالفت کا باقی نہیں چھوڑا اور بقول اخبار پایونیئر (Pioneer) ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام اتفاق سے کرسکیں۔''[87]

''میں ان لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو کہتے ہیں کہ علی گڑھ میں رہ کر مدرسے میں فساد ڈالیں گے تاکہ لوگ دیکھیں کہ وہ اور ہم دونوں کوٹھیوں میں رہتے ہیں یا جیل خانہ کی کوٹھڑیوں میں۔ خوب سمجھ لو کہ کس درجہ کے نتیجہ تک ہم مستعد ہیں۔ جس مدرسہ کو ہم نے جان بیچ کر بنایا ہے، اس کی بربادی بے جان جائے امکان سے خارج ہے۔''[88]

سید محمود کی جانشینی اور ٹرسٹی بل کے تنازعے کی تلخی ابھی زائل نہیں ہوئی تھی اور سرسیّد کی معمول کی خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی ابھی بحال نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور ناگہانی مصیبت آن پڑی۔ جولائی 1895ء میں یہ انکشاف ہوا کہ کالج کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال نے کالج فنڈ سے جعلی چیکوں کے ذریعے ایک خطیر رقم نکلوا کر اللّے تللّوں میں خُرد بُرد کردی ہے۔ غبن کی تفصیلی چھان بین پر پتہ چلا کہ کل ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپے کا غبن ہوا ہے۔ سرسیّد جنہوں نے پچھلے تقریباً بیس سال میں ایک ایک پیسہ اکٹھا کرکے

کالج فنڈ جمع کیا تھا اس ناگہانی صدمے سے نڈھال ہو کر رہ گئے۔ ایک دو ماہ تک تو ان کی کیفیت ایسی رہی کہ معلوم ہوتا تھا کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آخر رفتہ رفتہ بڑی مشکل سے سنبھلے اور اس ناقابلِ تلافی نقصان کو برداشت کرنے کا حوصلہ بہم پہنچایا۔ شام بہاری لال جون 1883ء سے کالج میں سیکریٹری کے دفتر میں ہیڈ کلرک کے طور پر کام کر رہا تھا۔ سرسید اس کے خاندان کو جانتے تھے۔ وہ ہندو کائستھ تھا۔ اس کا باپ مجسٹریٹ اور ای اے سی کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔ وہ اُسے اشراف خاندان سے سمجھتے تھے اور اس پر مکمل بھروسہ کرتے تھے۔ حالؔی لکھتے ہیں سرسیّد میں ایک خاص قسم کی مروّت بدرجہ غایت تھی۔ وہ کسی کو ملازم رکھ کر اس کے متعلق مطلق بدگمانی سے کام نہیں لیتے تھے۔ شام بہاری لال نے ان کے اعتماد کو دھوکہ دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ کوئی اس سے باز پُرس کرنے والا اور اس کے حساب کتاب کو چیک کرنے والا نہیں ہے تو کالج فنڈ میں غبن کرنا شروع کر دیا۔ چیک بک اس کی تحویل میں ہوتی تھی۔ وہ جعلی چیک بناتا، خود ہی سرسیّد کے دستخط کرتا اور رقم بنک سے نکلوا لیتا۔ ان جعلی چیکوں کے مندرجات کا اندراج نہ کاؤنٹر فائل پر کرتا، نہ حساب کتاب کے رجسٹروں میں لکھتا۔ اتفاق سے وہ بیمار پڑ گیا۔ اس کی غیر حاضری میں بنک سے جو چٹھیاں اور بیلنس شیٹ آئی، اس نے غبن کا راز فاش کر دیا۔ سرسیّد نے فوراً ایک انکوائری کمیٹی بٹھائی۔ تمام حسابات کی جانچ پڑتال کرنے سے پتہ چلا کہ شام بہاری لال کئی سال سے اس دھندے میں ملوث ہے۔ اپنی تقرری کے پہلے تین چار سال تو اس نے ٹھیک کام کیا۔ مگر جب دیکھا کہ سرسیّد کو اس پر اعتماد ہے، وہ جہاں انگلی رکھتا ہے دستخط کر دیتے ہیں، جو چیک بنا کر وہ لاتا ہے اُسے پڑھتے تک نہیں، کیش کے رجسٹروں کو بھی نہیں دیکھتے اور بنک سے جو ڈاک آتی ہے اُسے بھی وہ خود ہی کھولتا ہے تو اس نے کالج فنڈ سے اپنی جیب بھرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سرسیّد لکھتے ہیں کہ یوں لگتا ہے شام بہاری لال اس خیال میں تھا کہ سرسیّد کی عمر اتنی زیادہ ہو چکی ہے، ان کے مرنے کے بعد کسی کو اس غبن کا پتہ ہی نہ چلے گا اور اس کی چوری پر پردہ پڑا رہے گا۔ سرسیّد نے اس بات پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ یہ چوری ان کی زندگی میں ہی پکڑی گئی۔ انہوں نے شام بہاری لال کو پولیس کے حوالے کیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور سزا ملی مگر جلد ہی جیل میں اس نے خودکشی کر لی۔ وہ کچھ کھا کے مر رہا۔ اس نقصان سے سرسیّد پر تو جو گزری سو گزری، کالج کے اعتبار کو بھی ٹھیس پہنچی۔ چندہ آنا بند ہو گیا۔ مخالفوں نے ہزار باتیں بنائیں۔ بہر حال سرسیّد پر جو الزامات لوگوں نے لگائے وہ غفلت اور بے احتیاطی ہی کے

تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد نے اس قدر کام اپنے ذمے لے رکھے تھے کہ کالج فنڈ کا روزانہ تفصیلی جائزہ لینا ممکن ہی نہ تھا۔ پھر ان کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ شام بہاری لال یوں نمک حرامی کرے گا۔ دو تین ماہ میں سرسیّد اس صدمے سے جاں بر ہوئے تو جو بھاری نقصان کالج کو پہنچا تھا، اسے پورا کرنے کے لیے پھر کمر بستہ ہو گئے۔ چندے کی فراہمی کی مہم پر از سر نو نکل کھڑے ہوئے اور جب تک 1898ء میں مرض الموت نے انہیں بستر سے نہیں لگا دیا، برابر اس کوشش میں مصروف رہے۔

موت سے پہلے سرسیّد کو ایک اور جان لیوا غم کا سامنا کرنا ابھی باقی تھا۔ بلکہ مولانا حالؔی کا خیال ہے کہ یہی غم ان کی موت کا سبب بنا۔ 1897ء کے نصف آخر میں کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے سید محمود بیمار پڑ گئے۔ سرسیّد کو جب یہ معلوم ہوا کہ سید محمود شراب نوشی کی لت میں مبتلا ہیں تو ان پر تو گویا بجلی گر پڑی۔ بقولِ حالؔی اس انکشاف نے انہیں زندہ درگور کر دیا۔ ان کی ساری زندہ دلی اور شگفتگی جاتی رہی۔ لبوں پر مہر سکوت لگ گئی۔ ان کے بے تکلف دوست سیّد زین العابدین خان نے ایک دفعہ جب ان سے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں تو سرسیّد کہنے لگے ''اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔ اس لئے خاموشی کی عادت ڈالتا ہوں۔''[89]

سید محمود کا دُکھ اپنی جگہ لیکن ان کو اس عالم میں بھی قوم اور کالج کے مستقبل کی فکر کھائے جاتی تھی اور جو انکشاف سیّد محمود کے بارے میں ہوا، اس کے بعد تو یہ فکر اور بھی زیادہ جان لیوا ہو گئی تھی۔ سرسیّد کے اپنے الفاظ ہیں ''میں دن رات اس غم میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں کہ جب میرے کوچ کا وقت آن پہنچے گا تو کون شخص اس تمام کام کو اٹھائے گا اور کون شخص اس تمام کام کو انجام تک پہنچائے گا۔''[90]

کالج کے بارے میں ایک دوست کو لکھتے ہیں ''میں اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد جو کچھ مدرسۃ العلوم کا حال ہو سو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضہ میں چلا جائے۔ بُری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کو چلانے والی ہو۔''[91]

وفات

آخری سانس تک سرسیّد اپنی قوم کے بارے میں ہی سوچتے رہے اور اسی کی بہتری اور اسی کے مفادات کے تحفظ کی فکر کرتے رہے۔ 1898ء میں ہندوؤں نے اُردو اور فارسی کے خلاف از سرِ نو تحریک شروع کر دی۔ سرسیّد نے بیماری کی حالت میں حکومت کو ہندوؤں کی اس سازش سے خبر دار کیا اور مسلمانوں نے اس موقع پر الہ آباد میں اُردو کے حق میں جو کمیٹی بنائی اس کو اپنے مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔ اپنی وفات سے صرف آٹھ دن پہلے اس کمیٹی کو جو آخری خط لکھا اس میں کمیٹی کی تائید و حمایت میں ہر طرح کی مدد کرنے کے عزم کا اظہار کیا اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ اُردو کے خلاف ہندوؤں کی کوئی سازش کامیاب نہ ہونے دیں اور اس کے دفاع میں کوتاہی نہ کریں۔ ان کا ہمیشہ سے یہ مؤقف تھا کہ ہندوستان میں اگر اُردو اور فارسی نہ رہی تو مسلمان قوم کی پہچان باقی نہیں رہے گی۔

اپنے آخری دِنوں میں سرسیّد کو اطلاع ملی کہ کسی عیسائی نے حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے خلاف ایک رسالہ اُمہات المومنینؓ کے نام سے شائع کیا ہے۔ بلا تاخیر رسالہ منگوایا اور ایک طویل مضمون اس کے توڑ میں لکھا۔ پھر رسالے کے مندرجات کا نکتہ وار جواب لکھنے لگے۔ ابھی چند صفحے ہی لکھ پائے تھے کہ 27 مارچ 1898ء رات دس بجے پیغامِ اجل آ گیا۔ ان کی شہادت حاجی محمد اسماعیل خان کی کوٹھی میں ہوئی۔ جہاں وہ دس بارہ روز پہلے سیّد محمود کی کوٹھی سے منتقل ہو کر آ گئے تھے۔ غالباً سیّد محمود کے پاس مزید قیام انہیں گوارا نہ ہوا۔ اگلے روز یعنی 28 مارچ 1898ء شام پانچ بجے انہیں مسجد مدرسۃ العلوم کے احاطہ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ علی گڑھ کا سارا شہر تو ان کی نمازِ جنازہ میں موجود ہی تھا، ان کے انتقال کی خبر سن کر دُور دراز کے دیہات سے بھی سینکڑوں لوگ آن پہنچے۔ کالج کے کئی طلباء اور کئی نادار اور غریب لوگ ان کے غم میں رَو رہے تھے۔ ان کے سینکڑوں احباب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ سب اس عظیم شخص کی موت کے غم میں گریہ کناں تھے، جو مسلمانوں کی اکلوتی امید تھا۔ انہیں راستہ دکھانے والا اور

حوصلہ دینے والا تھا۔ حالی لکھتے ہیں:

''اس شخص کے مرنے پر جس غیر معمولی طریقہ سے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ غیر قوموں نے، نہ صرف ہندوستان بلکہ غیر ملکوں میں بھی رنج و افسوس کا اظہار کیا ہے، اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔''[92]

سر سیّد احمد خان کتنی قد آور شخصیت تھے اور انہوں نے لوحِ زمانہ پر کتنا گہرا اور روشن نقش چھوڑا تھا، اس کا کچھ اندازہ تعزیت کے ان ادارتی نوٹوں اور ان آراء سے ہوتا ہے جو ان کی موت پر دُنیا بھر کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں۔ مصر کے اخبار المویّد نے لکھا کہ ''مسلمانوں میں سیّد مرحوم بہت بڑے سیاست دان اور عظیم مدبّر تھے۔ ان کی وفات اِسلامی دُنیا کے لیۓ ایک عالمگیر سانحہ ہے۔'' ٹائمز آف لندن نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا'' وہ اپنے ہم مذہبوں کی حمایت کے لیۓ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کسی شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کرنے، ان کو اپنے تنزل کا احساس دلانے اور انہیں تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش میں سر سیّد کے مقابلے میں دسواں حصہ بھی کام نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اس معاملہ میں ان کی عمر بھر کی لگاتار کوشش اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیۓ تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔ علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی، اس کا پریس، اس کا اخبار علی گڑھ گزٹ اور محمڈن کالج جو انہوں نے مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں کے لیۓ کیمبرج اور آکسفوڈ کے نمونے پر بنایا، یہ سب ان کی ہمت، عقل اور فراخ حوصلگی کی شاندار یادگاریں ہیں۔'' پاؤنیئر (Pioneer) نے اپنی 29 مارچ 1898ء کی اشاعت میں لکھا ''سر سیّد احمد خان جو ایک دُور اندیش مدبّر ہونے کی وجہ سے تعلیم کے نہایت سر گرم حامی تھے، ان کے انتقال سے اس نہایت مفید، نتیجہ خیز اور زبردست سیاسی قوت کا خاتمہ ہو گیا ہے، جس نے موجودہ صدی کے آخری ربع میں مسلمانانِ ہند کو متحرک کر دیا تھا۔'' ٹائمز آف انڈیا نے 29 مارچ 1898ء کے شمارے میں ایک طویل اور مفصل مضمون میں سر سیّد احمد خان کو خراجِ عقیدت اور ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ جس میں کہا گیا کہ'' سر سیّد احمد خان کا یہ خیال تھا کہ اِسلام کو دوبارہ اس درجہ پر پہنچا دیا جائے، جو بارہویں صدی عیسوی میں علم و حکمت کا مربی ہونے کی حیثیت میں اسے حاصل تھا۔''

میرٹھ کے کلکٹر مسٹر پورٹر نے اپریل 1898ء میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جو سر سیّد احمد خان کی یاد میں منعقد ہوئی، ان الفاظ میں اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ''لندن کے سینٹ پال

کیتھڈرل میں سر کرسٹوفر کی لاش مدفون ہے۔ ان کی قبر پر لاطینی میں یہ مشہور کتبہ کندہ ہے۔ اگر تم اس کی یادگار تلاش کرنا چاہتے ہو تو اپنے چاروں طرف دیکھو۔ اسی طرح جب لوگ تم سے سرسیّد کی یادگار پوچھیں تو تم بھی اس عالی شان کالج کا حوالہ دے سکتے ہو جو سرسیّد کی کوششوں سے تعمیر ہوا ہے اور کہہ سکتے ہو کہ اپنے چاروں طرف دیکھو۔ تم نہ صرف بے جان پتھر، اینٹ اور مسالے (کی ایک عمارت) کو بلکہ ایک قومی کالج کی زندہ اور زندگی بخش طاقت کو اور اس کے تعلیم یافتہ گروہ کی بے داغ تربیت، حب الوطنی اور اخلاقی جرأت کو پیش کر سکو گے۔''

علامہ اقبالؒ کے مشہور اُستاد پروفیسر آرنلڈ جو لاہور آنے سے پہلے دس سال تک مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں پڑھاتے رہے، انجمن اسلامیہ لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے تعزیتی اجلاس میں سرسیّد کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ ''مجھ کو دس برس تک اس عجیب وغریب، عظیم اور بالاترین شخص سے تقرب اور دوستی کا شرف حاصل رہا ہے۔ نہیں نہیں بلکہ فرزند کے شفقت بھرے لفظ سے انہوں نے مجھ کو مخاطب کیا۔ ان دس برسوں میں سرسیّد سے تقریباً روزانہ ملنے کا اتفاق رہا۔ ان کے گھر کا دروازہ ہر وقت میرے لیئے کھلا رہتا تھا۔ جس قدر سرسیّد سے کوئی شخص زیادہ واقف ہوتا، اسی قدر ان کی بزرگی اور عظمت کا زیادہ معترف ہوتا تھا۔ حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سرسیّد احمد خان اس کے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دُنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں اتنی متنوع لیاقتیں اور اوصاف جمع ہوں۔ سرسیّد ایک ہی وقت میں اسلام کے محقق، علم کے حامی اور مبلغ، قوم کے سوشل ریفارمر، سیاست دان، مصنف، مفسر، مضمون نگار اور مقرر تھے۔ ان کا اثر اس سوچنے والے عالم کا سا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اُکساتا ہے۔ بلکہ وہ اعلانیہ دُنیا کے سامنے لوگوں کا راہبر بن کر اس طرح آئے کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے، اگر پوری دُنیا بھی اس کی مخالف ہو تو وہ ساری دُنیا سے لڑنے کے لیئے ہر وقت تیار اور آمادہ تھے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی، باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کی ظاہر ہوئے۔ یہ وہ رُتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا...... اس میں ایک مقناطیسی قوت تھی، جو لوگوں کے دِلوں کو تسخیر کرتی تھی۔ مجھے یقین ہے کوئی تحریک اسلام کی تاریخ میں ایسی نہ ملے گی جس میں ایک مسلمان شخص ایسے مسلمانوں کا سردار تسلیم ہوا ہو، جو اس کے مذہبی خیالات سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں...... برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے سرسیّد کی قدر و منزلت ہوئی، لیکن یہ عزت اور خطاب ہمیشہ بے طلب آئے۔ دُنیا کے سگ طینت لوگ اس بات پر جس قدر ان کا جی چاہے بھونکیں، لیکن میں جو برسوں سے سرسیّد کو جانتا ہوں اس بات کو سچ سمجھتا ہوں، میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہوں

،جس نے سرسیّد سے زیادہ شریف زندگی بسر کی ہو۔ جو جاہ طلبی میں اُن سے زیادہ بے غرض ہو اور جو اُن سے زیادہ سچ کا حامی اور دوسروں کی خدمت پر اپنے آپ کو وقف کر دینے والا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آج ہم اس کی موت پر روتے ہیں۔ اب اس جیسا کوئی کہاں ملے گا......؟ یہ شخص جس کو آپ رو رہے ہیں اس قدر مفلس تھا کہ نہ اُس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو جگہ۔ لیکن پھر بھی اس نے ایک بڑی دولت آپ کے لیئے چھوڑی ہے۔ وہ آپ ہی کے لیئے یہ کام چھوڑ گیا ہے کہ تعصب اور جہالت کے خلاف شریفانہ جہاد جاری رکھو اور آپ ہی کے سپرد یہ کام کر گیا ہے کہ اپنی افتادہ قوم کو اٹھاؤ۔ اس شخص نے آپ کے لیئے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے کہ اگر آپ نے اس کی پیروی کی تو وہ آپ کے لیئے اور آپ کی اولاد کے لیئے سب سے بڑی دولت ہوگی۔،،[93]

ایک انگریز شاعرہ نے سرسیّد کی وفات پر یہ مرثیہ لکھا:

''ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا
اس کی سایہ دار شاخیں چاروں طرف دُور تک جھومتیں تھیں
صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی تھی
ان شاخوں نے کثرت سے بیج بکھیرے
بنجر زمین جی اُٹھی
بیج پھوٹ نکلے
شگفتہ اور شاداب پھول کھلنے لگے
برنائی اور رعنائی سے آراستہ نونہالوں نے
ویران ریگستان کو گلستان بنا دیا
روؤ، اب اس شاہانہ درخت کے لیئے
اجل نے اسے گرا دیا ہے
غم کرو مگر نا اُمید ہونے کی کوئی وجہ نہیں
ہری بھری کھیتیاں جو اس کی سالہا سال کی محنت کا ثمر ہیں
اس کی قبر کے اردگرد لہلہا رہی ہیں
جن نونہالوں کی پرورش اس نے اپنی چھاؤں تلے کی ہے
وہ پھول پھل رہے ہیں
یہ نونہال اسی شاہانہ درخت کی طرح
ویرانوں کو گلزار بنائیں گے۔،،[94]

شخصیت و کردار

سرسیّد کے کارہائے نمایاں جس طرح غیر معمولی اور حیرت میں ڈالنے والے ہیں اسی طرح ان کی شکل وشباہت اور ذاتی عادات وخصائل بھی غیر معمولی اور نا قابلِ فراموش تھے۔حالؔی نے ان کا حُلیہ یوں بیان کیا ہے۔

''رنگ سرخ وسفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھنویں جدا جدا، آنکھیں روشن، نہ چھوٹی نہ بہت بڑی، ناک نسبتاً چہرے کی شان کے مقابلہ میں کسی قدر چھوٹی، کان لمبے، چہرہ بارُعب ہونے کے باوجود دلکش، جسم بہت فربہ، قد لمبا مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ نما، ہڈی چکلی، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء نہایت قوی اور زبردست اور متناسب، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من۔ بڑھاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے۔ اگرچہ خاموشی اور فکر کے وقت سرسیّد کا چہرہ نہایت عبوس اور ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا۔مگر گفتگو کے وقت اس سے مسرت، زندہ دلی اور گرم جوشی ٹپکتی تھی۔ جس طرح اخلاق میں مطلق تصنع نہ تھا اسی طرح بات چیت میں بالکل بناوٹ نہ تھی۔ زبان دلی کی تھی مگر لب ولہجہ دلی کا سانہیں معلوم ہوتا تھا۔زبان قینچی کی طرح جلدی جلدی نہیں چلتی تھی، نہ زیادہ محاورے اور لُغت زبان پر آتے تھے محض سیدھے سادے طور پر عام فہم بول چال میں وہ ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔''[95]

کرنل گراہم کی کتاب ''دی لائف اینڈ ورک آف سرسیّد احمد خان'' کے شروع میں سرسیّد کی ایک خوبصورت تصویر دی گئی ہے جب یہ کتاب پہلی دفعہ چھپی تو بمبئی گزٹ میں اس پر جو تبصرہ آیا اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

”کتاب شروع کرنے سے پہلے جب ہماری نظر سر سیّد احمد خان کی خوبصورت تصویر پر پڑتی ہے تو ہم ان کی طرف اپنے دل میں ایک لطف انگیز کشش محسوس کرتے ہیں۔ تصویر کیا ہے؟ گویا ایک شیر، پُر رُعب اور پُر ہیبت صورت کا، بہادر اور دلیر، ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ ہم حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ قدیم جنگ جوئی کے زمانے میں اس شخص کا کیا پیشہ ہوتا۔ اُس کی بہادری اور الو العزمی ملکوں کو فتح کرتی، وہی اب دلوں کو فتح اور جہل و تعصب کو تاخت و تاراج کرتی ہے۔“[96]

حالؔی نے لکھا ہے کہ کسی حکیم کا قول ہے سچائی کی اگر کوئی زندہ شکل و صورت ہوتی تو یقیناً وہ شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی۔ سر سیّد کی صورت سے جو رُعب، دبدبہ اور دلیری ٹپکتی تھی وہ درحقیقت ان کے کردار کی مضبوطی ان کے قول و فعل کی صداقت اور ان کے اخلاق کی بلندی تھی۔ پروفیسر آرنلڈ جو لاہور گورنمنٹ کالج میں آنے سے پہلے دس سال علی گڑھ کالج میں سر سیّد کے پاس رہے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے زندگی میں سر سیّد جیسا شریف اور خوددار شخص کبھی نہیں دیکھا۔ بڑے آدمی کی خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ جتنے آپ اس کے قریب جائیں اس کی شخصیت آپ کی نظر میں کسی اونچے مینار یا پہاڑ کی طرح اور زیادہ بلند ہوتی جاتی ہے۔ آپ اس کی بڑائی اور اخلاقِ حسنہ کے اور زیادہ گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ یہی خوبی سر سیّد احمد خان میں تھی جو کوئی جس قدر ان کے قریب تھا اتنا ہی ان کی عظمت کا زیادہ قائل اور معترف تھا۔ کرنل گراہم نے لکھا ہے ”میں سر سیّد کو ایک چوتھائی صدی سے جانتا ہوں جتنی زیادہ ان کی میری واقفیت بڑھتی گئی اسی قدر ان کی قدر و منزلت میرے دِل میں زیادہ ہوتی گئی۔“[97] محمڈن کالج علی گڑھ کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک نے جنھوں نے ایک طویل عرصہ سر سیّد کے ساتھ کام کیا، سر سیّد کی موت پر ان کے بارے میں کہا ”اس کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اس کے اخلاق اُن سے بھی بڑے تھے۔“

چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک ان کے مخالفین نے ان کے خلاف ہر طرح کا پروپیگنڈہ کیا۔ انہیں کافر ملحد، کرستان، بے دین اور گردن مروڑی مرغی کھانے والا کہا۔ ان پر انگریزوں کی چاپلوسی اور ابن الوقتی کے الزامات لگائے مگر کوئی ان پر کسی اخلاقی بے راہ روی یا ان کے قول و فعل میں کسی تضاد یا کسی غلط بیانی کا کوئی الزام نہیں لگا سکا۔ حالانکہ ان کے مخالفین ہر وقت اس تاک میں رہتے تھے کہ ان پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

سرسیّد کی شخصیت و کردار کو اُن کے سب سے پہلے سوانح نگار کرنل گراہم نے اس طرح سے بیان کیا ہے۔

''وہ اپنے بے شمار دوستوں کی بڑی خندہ پیشانی سے اور دل کھول کر خاطر مدارات کرتے ہیں۔اُن کے دوستوں میں مسلمان، سکھ، ہندو، انگریز سب شامل ہیں اور یہ دوست ہندوستان کے ہر حصے سے ان کے پاس آتے ہیں۔ان کے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس پر ایک ادبی ماحول چھایا رہتا ہے۔ان کے بیٹھنے کے کمرے میں جہاں وہ اپنے دن کا زیادہ حصہ گزارتے ہیں ایک میز ہے جو کتابوں اور کاغذوں سے لدی ہوئی ہے۔ان کی ایک لائبریری بھی ہے جس کا کمرہ بہت شاندار ہے۔اس میں انواع واقسام کی مگر زیادہ تر مذہبی کتابیں ہیں۔ان کے گول کمرے میں وہ ڈپلومہ لگا ہوا ہے جو ان کو دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو ہونے پر ملا اور اس پر ان کو بہت ناز بھی ہے۔دیوار پر اُن کے دوست سرجان اسٹریچی کی ایک قد آدم تصویر آویزاں ہے۔علاوہ اس کے دیگر تصاویر سر سالار جنگ، لارڈ لٹن اور ہز ہائی نس نظام حیدر آباد کی ہیں۔ان کے دن خوشگواری سے گزرتے ہیں۔علاوہ قومی اہمیت کے مسائل پر وسیع النظری کے ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کام کرنے کی ایک خاص طاقت ہے وہ کام کے متعلق باریک سے باریک تفصیل بھی نظر انداز نہیں کرتے۔صبح چار بجے اٹھتے ہیں اور تحریر وتصنیف کا کام کرتے ہیں۔پھر آنے والوں سے ملتے ہیں۔جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں۔ساتھ ساتھ کالج کی کمیٹیوں کے معتمد یعنی سیکرٹری کے فرائض نبھاتے جاتے ہیں۔یہ مصروفیات اکثر رات گئے تک ان کا وقت لے لیتی ہیں۔وہ کہا کرتے تھے کہ اعلیٰ درجہ کی دماغی محنت اچھی صحت اور طویل زندگی کی ضامن ہے۔ان کا کھانا یورپین طرز کا ہوتا ہے لیکن کسی قسم کے نشہ آور مشروبات استعمال نہیں کرتے، صرف سادہ پانی پیتے ہیں۔رات کے کھانے پر یا کھانے کے بعد ان کے بعض احباب آجاتے ہیں اور فزکس، مذہب وسیاست، فارسی شعر وشاعری اور لطائف وظرائف موضوع گفتگو بنتے ہیں۔

اُن کا قد اوسط اور جسم گٹھا ہوا ہے، وزن 19 سٹون سے نکلتا ہوا۔ان کا چہرہ شاندار ہے اس سے ان کا عزم اور قوتِ ارادی ظاہر ہوتی ہے۔جب وہ آرام کرتے ہیں تو چہرے پر سختی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔مگر جب بات کرتے ہیں تو ان کے دل کا جوش وخروش جھلکنے لگتا ہے۔اکثر اوقات قوم کی اصلاح پر ہی گفتگو کرتے ہیں۔ان میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ان کی بیوی کو مرے ہوئے

عرصہ ہو گیا ہے۔ بعض اوقات آنکھ مار کر کہتے ہیں کہ میرا ارادہ پھر شادی کرنے کا ہے مگر اب کسی انگریز عورت سے کروں گا لیکن شرط یہ ہے کہ وہ 80 برس کی بوڑھی ہو اور اس کے کوئی دانت نہ ہو۔ وہ ایک پیدائشی مقرر اور خطیب ہیں جس وقت گرم جوشی سے تقریر کرتے ہیں تو ان کا طرزِ تقریر گلیڈ سٹون (انگلستان کا مشہور وزیرِ اعظم اور مقرر) کا سا ہو جاتا ہے۔ جذبات سے ان کے ہونٹ تھرتھرانے لگتے ہیں آواز بھرّا جاتی ہے اور بدن کانپنے لگتا ہے، شدتِ جذبات کا یہ اظہار سامعین پر خاص اور فوری اثر رکھتا ہے۔''[98]

سرسیّد کا سب سے بڑا وصف ان کی سچائی اور راست بازی تھی۔ وہ کوئی ایسی بات ہرگز نہیں کرتے تھے جس کی صداقت پر انہیں کامل یقین نہ ہوتا۔ کسی مصلحت یا خوف کو انہوں نے کبھی آڑے نہ آنے دیا۔ ان کا مقولہ تھا کہ جیسا دِل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور جو کچھ کہو اس کو کر دکھاؤ۔ ایک دوست کو کسی بات پر نصیحت کے انداز میں لکھتے ہیں ''میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو آپ کا دِل اس کو سچ جانتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتا اور اس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلافِ کانشنس Conscience بلکہ خلافِ ایمان داری کے کام کیا۔ میں اس خیال سے کہ آپ میری کسی تحریر کا بُرا نہ مانیں گے، جو میرے دِل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں۔ خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجے پر ہوں اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے۔''[99]

حاؔلی لکھتے ہیں ''سرسیّد نے محض اپنی راست بازی کی وجہ سے ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اس کے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ جس بات پر دِل سے یقین کر لیا اسی کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا۔ جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اس کے کہنے اور کرنے میں کسی مخالفت کی کچھ پروا نہیں کی۔ ممکن ہے کہ سرسیّد سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر انہوں نے کبھی کوئی کام اپنی کانشنس (یعنی اپنے ضمیر) کے خلاف نہیں کیا۔''[100]

بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرسیّد نے قرآن کی جو تفسیر لکھی ہے تو محض اس مصلحت سے لکھی ہے کہ سائنس کی رُو سے قرآن پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ سرسیّد کو جب لوگوں کے اس تاثر کا پتہ چلا تو انہوں نے نہایت جوش میں آ کر کہا ''اگر دینِ اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً

اسلام کو ترک کر دیتا۔''[101]

وہ سیّد مہدی علی خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں''میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں۔ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود اپنی تحقیقات سے حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب چھوڑ دیتا۔''

''جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دینِ اسلام کو حق پر سمجھتا ہوں اس قدر یقین...... بڑی بڑی لمبی داڑھی والوں کو اور ہزار ہزار دانہ تسبیح والوں کو اور جو مکّہ مدینہ سے پیر، خلیفہ اور مرشد کا جبہ و دستار لے کر آتے ہیں، اُن کو بھی نہیں ہے۔''[102]

انہیں اکثر اپنے وطنِ مالوف دہلی مرحوم کی یاد ستاتی تھی وہاں کی پرانی صحبتوں کا تذکرہ کرتے تھے اور بچھڑے ہوئے دوستوں کو یاد کرتے تھے۔ ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں۔

''جہاں میں پیدا ہوا، جہاں میرے بزرگوں کی، جہاں میرے عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے دوست اور میرے عزیز اب تک رہتے ہیں جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا کہ میں بنا ہوں اور اس میں ہی پھر میری خاک مل جائے گی۔''[103]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں''وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالبؔ کی دِل کش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہ کی دلچسپ و دِل رُبا فصاحت سے، شیفتہ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے، صہبائی جان نواز کے مے خانۂ محبت سے دِل شاد شاد رہتا تھا۔ یہ باتیں تو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کُجا وہ صحبتیں اور کُجا وہ مجلسیں، کہاں وہ آزردہ اور کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علماء اور کہاں وہ صلحاء، صرف یاد ہی یاد ہے۔''[104]

سرسیّد بڑی محبت کرنے والے انسان تھے دوستوں اور عزیز رشتہ داروں سے اپنے تعلقات میں وہ جس بے پناہ محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتے تھے اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہیں اپنی والدہ سے اس قدر محبت تھی کہ والدہ کی وفات کے کوئی 35 سال بعد جب ایک دفعہ وہ میرٹھ میں تقریر کر رہے تھے تو اپنی والدہ کا ذکر کیا اور پھر ان کا دِل ایسا بھر آیا کہ آنکھیں تر ہو گئیں۔ اپنے بڑے بھائی سیّد محمد کی وفات کا صدمہ آخر دم تک تازہ رہا۔ لوگ ان کے سامنے ان کے مرحوم بھائی کا ذکر کرنے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں اور ان کی حالت غیر ہو جائے۔ انہوں نے اپنے بھائی کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے یعنی اپنے بھتیجے کو ہمیشہ اپنے پاس رکھا اور اپنے بچوں سے بڑھ کر اس سے

پیار کیا۔ وہ بچپن میں ہمیشہ سرسیّد کے پاس سویا کرتا تھا اپنی ماں کے بجائے انہی کے پاس رہتا تھا۔

حالؔی لکھتے ہیں کہ اُن کی خوشی بلکہ ان کی زندگی کا مدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا، کام اور دوستوں سے ملاقات ان کو شاید ہی کبھی ایسی خوشی ہوئی ہو جیسی اپنے مخلص دوستوں سے مل کر حاصل ہوتی تھی۔ وہ فی الواقع دوستوں کو اپنی زندگانی کا ایک اہم عنصر سمجھتے تھے۔ دن بھر میں کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ ایسا نہ ہوتا جب انہیں کام سے فرصت ہو۔ ایسے شخص کو تنہائی پسند ہونا چاہیئے مگر دوستوں سے کبھی ان کا جی نہ اُکتاتا تھا۔ ان کے دوست بھی انہیں بے حد چاہتے تھے اور ان کی خوشنودی کے لیئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ بقول حالؔی ان کے ایک عزیز دوست کہا کرتے تھے کہ قومی ہمدردی تو ہم کو معلوم نہیں کس چیز کو کہتے ہیں ہاں مگر سرسیّد احمد خان کی زبان میں ضرور جادو ہے کہ جہاں روپیہ دور وپیہ دینا مشکل معلوم ہوتا ہے وہاں اُن کے اشارے پر آنکھ بند کر کے سینکڑوں روپے کا چندہ دے دیتے ہیں۔

سرسیّد اپنے بے تکلف اور قریبی دوستوں کو کس قدر چاہتے تھے اس کا اندازہ خان بہادر سیّد زین العابدین کے نام ان کے اس خط سے ہوتا ہے۔

> ''مکرمی زینو! ابھی تمہارا خط پہنچا کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا۔ مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے۔ مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو بُرا کہوں۔ دِل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں، ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سُونا نہیں ہوا بلکہ دل سُونا ہو گیا۔ صبح کو اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا، تم یاد آتے ہو۔''[105]

نواب محسن الملک سیّد مہدی علی خان نے ایک موقع پر سرسیّد کا ذکر کرتے ہوئے کہا ''میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں۔ میری اُن سے پہلی ملاقات 1863ء میں ہوئی تھی اس وقت سے لے کر آج تک ایک بات بھی اُن میں ایسی نہیں دیکھی جس کو بُرا کہہ سکوں۔ اس شخص کی ایسی سچی محبت اور وفاداری دُنیا میں کہیں نہیں دیکھی۔ البتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی سے اس قدر محبت ہو سکتی ہے اور نہ باپ سے، جیسا کہ اس شخص کی محبت خدا نے دل میں ڈال دی ہے۔''[106]

مخالفین نے تو انہیں انگریزوں کا ایجنٹ اور خوشامدی کہا ہے مگر ان کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ خودداری اور عزتِ نفس کا جتنا خیال انہیں تھا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ آگرہ کے انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر واٹسن سے جا کر ملنے سے انہوں نے اس لیئے انکار کر دیا کہ اس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جو ہندوستانی اُسے ملنے آئے جُوتے اُتار کر اس کے کمرے میں داخل ہو۔ اس نے اپنے گھر ڈنر پر سر سیّد کو مدعو کیا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ آگرہ میں سائنٹیفک سوسائٹی کے دفتر کی شاندار عمارت جب تیار ہوئی تو اس کے افتتاح کے لیئے انہوں نے میرٹھ کے کمشنر کو دعوت دی۔ کمشنر نے خوشی اور شکریہ کے ساتھ سر سیّد احمد خان کی دعوت کو قبول کر لیا مگر بعد میں جب اس نے مدعوین کی فہرست میں علی گڑھ کے ایک مسلمان رئیس عنایت اللہ خان کا نام دیکھا جسے وہ پسند نہیں کرتا تھا تو اس نے سر سیّد کو کہلا بھیجا کہ اگر عنایت اللہ خان رسمِ افتتاح کے موقع پر موجود ہوگا تو اُسے تقریب میں شرکت سے معاف رکھا جائے۔ ڈپٹی کمشنر علی گڑھ نے سر سیّد کو سمجھایا کہ کمشنر صاحب کی خواہش کے مطابق عنایت اللہ خان کو تقریب میں آنے سے باز رکھا جائے۔ مگر سر سیّد اس بات کو ماننے پر ہرگز تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے ایک محسن اور مربی کو رسمِ افتتاح کے موقع پر نہ بلایا جائے۔ آخر علی گڑھ کے سیشن جج نے کمشنر کو راضی کیا کہ وہ اپنی شرط واپس لیں اور حسبِ دعوت آ کر رسم افتتاح ادا کریں۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر نے ایک دفعہ سر سیّد سے کہا کہ آگرہ کے نئے ڈپٹی کمشنر کو شکایت ہے کہ جب سے وہ آیا ہے آپ اس سے ملنے نہیں گئے۔ سر سیّد نے جواب دیا ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ نیا آنے والا خود آ کر ملتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کو چاہیئے تھا خود آ کر مجھ سے ملتے۔ چنانچہ گورنر صاحب کے کہنے پر ڈپٹی کمشنر سر سیّد احمد خان سے ملنے اُن کی رہائش گاہ پر گیا۔ والی رامپور نواب کلب علی خان ہر ملاقاتی کو اپنے سامنے نیچے فرش پر بچھی دری پر بٹھاتا تھا۔ سر سیّد علی گڑھ کالج کے لیئے چندہ مانگنے اس کے پاس گئے مگر اس سے ملاقات کی شرط یہ رکھی کہ وہ سر سیّد کے بیٹھنے کے لئے اپنے سامنے ایک کرسی رکھوانے کا اہتمام کریں گے۔ اسی طرح نظام حیدر آباد دکن سے بھی وہ برابری کی سطح پر ملتے تھے۔

سر سیّد جس طرح بڑے سے بڑے شخص سے برابری اور مساوات کی سطح پر ملتے تھے اسی طرح چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی برابری اور مساوات کا سلوک روا رکھتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ''حافظ عبدالرحمٰن جو 45 برس سر سیّد صاحب کے رفیق رہے وہ رہتک

میں بھی ان کے ساتھ تھے اگر چہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سیّد صاحب قلتِ تنخواہ کے سبب ان کو اپنے پاس رکھتے تھے ان سے اکثر ہنسی وچہل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حافظ جی اپنی ترقی کے لئے اکثر کہا کرتے تھے مگر چونکہ ترقی کی گنجائش نہیں تھی سیّد صاحب ہنسی سے یہ کہہ کرٹال دیتے کہ تمہارا خط اچھا نہیں اور نہ کبھی اچھا ہوسکتا ہے۔ اس لئے ترقی نہیں دی جاسکتی۔'' ایک دن سیّد صاحب نے حافظ جی کو کہا'' بھلا صاحب! اگر تم بادشاہ ہوجاؤ تو مجھے کیا عہدہ دو؟ حافظ جی نے وہ تمام سلوک جو سیّد صاحب ان کے ساتھ کرتے تھے بیان کیئے' کہ میں آپ کی بڑی خاطر کروں گا، دونوں وقت آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں گا، رات کو آپ کا پلنگ اپنے پلنگ کے برابر بچھاؤں گا اور چناں کروں گا اور چنیں کروں گا۔'' سیّد صاحب نے کہا'' ان باتوں کو جانے دو، یہ بتاؤ کہ مجھے عہدہ کیا دوگے؟'' حافظ جی نے ذرا رُوکھی صورت بنا کر کہا'' حضرت میں مجبور ہوں کیونکہ آپ کا خط اچھا نہیں اس لیے کوئی عہدہ نہ دے سکوں گا۔'' سیّد صاحب اور ہم سب لوگ یہ گرم فقرہ سُن کر پھڑک گئے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔''[107]

جیسا کہ پہلے ذِکر ہوا ہے کہ سر سیّد میں شوخی اور ظرافت گویا کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انتہا کے زندہ دل اور خوش طبع تھے۔ ایک دفعہ آگرہ کے ایک جج خان بہادر مولوی سیّد فرید الدین احمد نے انہیں خط لکھا اور آخر میں انکسار کے طور پر لکھ دیا'' گنہگار فرید۔'' سر سیّد نے اس کے خط کا جواب دیتے ہوئے اُسے یوں مخاطب کیا'' اے گنہگار فرید!''

ایک دفعہ ریلوے کے سفر کے دوران ایک انگریز پادری سر سیّد احمد خان سے کہنے لگا'' میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے۔ میں آپ سے ملنے کا بڑا متمنی تھا۔ میں خدا کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

سر سیّد پادریوں کے تعصب اور اسلام پر ان کے بے سروپا اور ناروا حملوں سے بڑے نالاں تھے اور پھر خدا کا جو تصور ان لوگوں کے ذہن میں تھا اُسے بھی خوب سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسے خدا کے قائل ہیں جس کے انسانوں کی طرح بیٹے بھی ہوسکتے ہیں جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ پادری کی بات کے جواب میں انہوں نے تجاہلِ عارفانہ سے کہا'' میں سمجھا نہیں آپ مجھ سے کس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں؟''

اس نے کہا'' خدا کے بارے میں۔''

سر سیّد نے جواب دیا'' میں اس کو نہیں جانتا۔''

وہ بڑی حیرت سے بولا ''ایں ! آپ خدا کو نہیں جانتے۔'' سرسید نے کہا ''میں خدا کو کس طرح جانتا؟ میری اس سے کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

پادری کو اور زیادہ حیران و پریشان دیکھ کر سرسید نے کسی شخص کا نام لے کر اس سے پوچھا ''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

وہ کہنے لگا ''نہیں میں اسے نہیں جانتا۔ میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔''

سرسیّد نے کہا ''آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ جس سے ملاقات ہی نہ ہوئی ہو اُسے آپ بھلا کیسے جان سکتے ہیں؟ اسی طرح میری بھی آج تک خدا سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ کبھی اس نے مجھے اپنے گھر ڈنر پر بلایا نہ کبھی وہ مجھ سے ملاقات کرنے میرے گھر آیا۔ میں اسے کیوں کر جان سکتا ہوں؟''

یہ سن کر وہ پادری بھونچکا سا رہ گیا اور اپنے ساتھی سے انگریزی میں کہنے لگا ''میں نے تو سنا تھا یہ شخص بہت بڑا مذہبی سکالر ہے مگر یہ تو پکا کافر ہے۔''

سرسیّد کی عادت تھی کہ وہ بعض اوقات اسی طرح لطیف پیرائے میں اپنے مذہبی اعتقادات کا اظہار بڑے دلچسپ اور معنی خیز انداز میں کرتے تھے۔ سرسیّد سے ایک دفعہ کسی پادری نے کہا کہ کربلا کے میدان میں یزیدی لشکر حضرت محمد ﷺ کے پیارے نواسے کو قتل کرنے کے در پے ہوا تو اس وقت حضرت محمد ﷺ نے اللہ سے کیوں التجا نہ کی کہ میرے نواسے کو بچا لو۔'' سرسیّد نے جواب دیا ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے اللہ سے التجا کی تھی مگر اللہ نے جواب دیا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں لوگوں نے میرے اپنے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو سولی پر چڑھا دیا میں اُسے نہ بچا سکا۔ تمہارے نواسے کو کیوں کر بچاؤں؟''

سرسیّد نے ایک دفعہ اپنے کسی مضمون میں لکھ دیا کہ اجماع جیسا کہ سنی سمجھتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ ایک شیعہ عالم نے جب یہ پڑھا تو دوڑا دوڑا سرسیّد احمد خان کی ملاقات کو آیا اور اُن کے اس فقرے کا حوالہ دے کر کہنے لگا ''میں آپ کے خیال سے بڑا متاثر ہُوا ہوں۔ اس طرح تو صدیق اکبرؓ کی خلافت غلط ٹھہری۔ سرسید بولے ''غلط ٹھہرتی ہے تو ٹھہرے، ہمیں کیا؟'' وہ اس فقرے پر اور چہکا اور بڑے اشتیاق سے پوچھنے لگا ''سیّد صاحب اگر آپ اس موقع پر موجود ہوتے تو آپ بھلا کس کی خلافت کے لیئے کوشش کرتے؟ آپ یقیناً حضرت علیؓ کی طرفداری کرتے۔''

سرسیّد نے جواب دیا ''بھائی مجھے کسی کی خلافت کے لیئے کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی میں تو اپنی

ہی خلافت کا ڈول ڈالتا۔''

ان صاحب نے یہ سنناتھا کہ اُٹھے اور مزید کچھ کہے بغیر رُخصت ہو گئے۔

نہایت سنجیدہ مذہبی مسائل کے بیان میں بھی شوخی اور ظرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ نماز میں صرف ترجمہ پڑھنے کے مسئلے پر لکھتے ہیں ''نماز میں قرآن مجید بہ لفظ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔''[108]

سید مہدی علی خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں، وہ دیکھتا ہے جو بات کہتے ہیں، سن لیتا ہے، جو بات دل میں لاتے ہیں، جان لیتا ہے، ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے، نہ زمین پر چھوڑے، نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو الگ ہو، نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔''[109]

سرسیّد کا کارنامہ

سرسیّد نے اپنے فکر و عمل سے زندگی کے مختلف اور متنوع شعبوں میں جن اصلاحی تحریکوں کو شروع کیا، پورے ملک میں اس کے ہمہ گیر اور دُور رس اثرات مرتب ہوئے۔ پیغمبروں کے علاوہ غالباً تاریخ میں کسی شخص کی انفرادی جدوجہد نے معاشرے کی پوری زندگی کے سبھی پہلوؤں کو اس طرح متاثر نہیں کیا ہوگا جس طرح سرسیّد احمد خان نے کیا۔ ماں باپ اور اساتذہ کی تربیت جس طرح بچے کی پوری شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتی ہے نہ صرف اس کی عادات واطوار کو بناتی ہے بلکہ اس کے خیالات اور نظریہ حیات کی بھی تشکیل کرتی ہے، اس کے ظاہری طور طریقوں، چال ڈھال، اس کے لباس، اس کی دلچسپیوں، اس کے مشاغل اور زندگی میں اس کی ترجیحات کا رُخ متعین کرتی ہے، اس کے کردار اور شخصیت پر گہرے نقوش ثبت کرتی ہے اور مستقبل کے بارے میں اسے امید اور یقین کی دولت سے مالا مال کرتی ہے، اسی طرح سرسیّد نے اپنی تلقین تبلیغ اور چالیس سال پر پھیلی ہوئی لگاتار اور انتھک کوششوں سے اپنی قوم کی تربیت کی۔ سرسیّد کا کام والدین اور اساتذہ کے کام سے کہیں مشکل اور کٹھن تھا۔ والدین اور اساتذہ جس بچے کی پرورش اور تربیت کرتے ہیں وہ زوال اور مایوسی کی اُس دلدل میں نہیں پڑا ہوتا جس میں سرسیّد کی قوم دھنسی ہوئی تھی۔ پھر بچے کو ماں باپ کی طرف ایک قدرتی میلان اور رغبت ہوتی ہے وہ محبت اور شفقت سے جو بات اُسے بتاتے ہیں وہ شوق سے سنتا ہے۔ عمل کا جذبہ اس میں فطری طور پر اُبھرتا ہے اسی طرح ایک شفیق اور لائق اتالیق سے بھی شاگرد کو بڑی عقیدت ہوتی ہے اور اسی عقیدت اور عزت واحترام کے باعث جو اس کے دل ودماغ میں موجزن ہوتا ہے وہ اپنے اتالیق کی انگلی پکڑ کر بے محابا آگے بڑھتا جاتا ہے جب کہ سرسیّد کو ایسی قوم کی تعلیم وتربیت کرنی پڑی جو نہ صرف اپنی حالت کو سدھارنے اور ترقی کی طرف قدم بڑھانے پر کسی صورت آمادہ ہی نہ تھی بلکہ خود سرسیّد کے بھی خلاف تھی۔ شوق اور عقیدت کے بجائے اس کے دل میں سرسیّد کے بارے میں بدگمانیاں تھیں،

تعصبات تھے۔ سرسید ایک گری ہوئی قوم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اُوپر اٹھاتے تھے کہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو اور وہ اُن کا ہاتھ جھٹکتی تھی۔ سرسید کا کام کہیں زیادہ مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ ایک دانا کا قول ہے کہ ایک آدمی کسی گھوڑے کو پکڑ کر ندی تک لے جا سکتا ہے مگر دس آدمی اسے زبردستی پانی نہیں پلا سکتے۔ قوم پیاس سے مر رہی تھی مگر اس کے باوجود اس کی بدبختی اس طرح اس کے سر پر سوار تھی کہ وہ ندی کا رُخ کرنے کو بھی تیار نہ تھی۔ سرسید نے اپنی مسلسل اور اَن تھک جدوجہد سے یہ ناممکن کام ممکن کر دکھایا اور اپنی قوم کے پیاسے اور پژمردہ برگ و بار کو آبِ حیات سے سرسبز و شاداب کر دیا۔ جہاں ریت اُڑتی تھی اور بگولے رقص کرتے تھے وہاں سبزہ زار بننے لگے اور پھول کھلنے لگے۔

سرسید سے پہلے قوم ہی کہاں تھی؟ قوم کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ کسی کو اس بات کا ادراک ہی نہ تھا کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان قوم بھی ہے کسی سے پوچھا جاتا کہ تمہاری قوم کیا ہے تو وہ جواب دیتا میری قوم پٹھان ہے کوئی کہتا میری قوم سید ہے کوئی کہتا مغل ہے۔ دراصل ہندوستان میں ہمیشہ شخصی حکومتیں رہیں۔ مطلق العنان بادشاہ ہی ہر چیز کا مرکز اور محور تھے۔ وفاداریاں کسی قومی جذبے یا ملکی مفاد سے وابستہ نہ تھیں۔ ہر تعلق کی بنیاد بادشاہ تھا۔ تخت نشینی کی جتنی جنگیں ہوئیں ان میں باہم متحارب لشکروں کے سامنے کسی قسم کا کوئی قومی ملکی یا مذہبی نصب العین نہ تھا۔ ایک فوج اورنگ زیب کے لیئے لڑ رہی تھی تو دوسری داراشکوہ کے لیئے۔ ہمایوں کے ساتھ جو لشکر تھا وہ الگ تھا اور اس کے بھائی کامران کے پاس بیس ہزار سواروں کا جو چاق و چوبند اور مضبوط رسالہ تھا اس کا راستہ الگ تھا۔ دونوں لشکر مل کر شیر شاہ سوری کو شکست دے سکتے تھے مگر کوئی ایسا جذبہ یا نصب العین نہ تھا جو دونوں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کرتا۔ شیر شاہ سوری بھی مسلمان تھا اور نصیر الدین ہمایوں بھی۔ مگر دونوں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اگر اُن کے سامنے کوئی مقصد یا نصب العین تھا تو وہ محض اپنا اپنا ذاتی اقتدار اور مفاد تھا۔ کسی مذہبی یا اجتماعی یا قومی نصب العین کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ یہ تصور بلا شبہ سرسید احمد خان نے پیدا کیا۔ قوم، قومی ہمدردی، قومی ترقی، قومی مفاد، قومی جذبہ اور قومی عزت ایسے الفاظ ہیں جنھیں ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کے حوالے سے، سب سے پہلے سرسید احمد خان نے استعمال کیا۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں بار بار ان الفاظ کی تکرار ملتی ہے۔ انہی کے اثر سے ان الفاظ نے مسلمانوں کے شعر و ادب اور ثقافت میں رواج پایا۔ مولوی عبدالحق کے الفاظ میں ''سرسید نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سید، شیخ، مغل، پٹھان تھی۔ سرسید نے اسے نیشن کا ہم معنی بنا دیا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا

کیا۔ 110

سرسید سے پہلے مسلمانوں میں قومی مفاد اور قومی ہمدردی کا تصور موجود ہی نہ تھا۔ لوگوں کو بس اپنے ذاتی مفادات کا خیال ہوتا تھا یا زیادہ سے زیادہ وہ اپنے رشتہ داروں یا خاندان کے فائدے کی بات سوچتے تھے۔ قومی سوچ، قومی جذبے یا قوم کے لیے کسی قسم کی قربانی دینے یا کسی قسم کے ایثار کا مظاہرہ کرنے کا کوئی خیال وہ اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ شخصی حکومتوں کے دور میں مل جل کر قوم کے لئے کام کرنے کا نہ انہیں کوئی اور اک تھا نہ تجربہ۔ اپنی اجتماعی کوششوں میں بھی وہ صرف اسی کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے جس کام کے کرنے کا خیال بادشاہِ وقت کو ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں کے زمانے میں عظیم الشان مقبرے تو تعمیر کیے گئے، بادشاہوں نے اپنا دل بہلانے کے لئے چاردیواریوں کے اندر باغات تو لگوائے اور خدا کو خوش کرنے اور دُنیا میں نام کمانے کے لئے مسجدیں تو بنوائیں مگر رفاہِ عامہ کا کوئی بڑا منصوبہ ان کے ذہن میں نہیں آیا، جس پر انہوں نے لاکھوں، کروڑوں روپے خرچ کیئے ہوں۔ کوئی ہسپتال، کوئی یونیورسٹی، کوئی محتاج خانہ ہنرمندی اور مختلف فنون کی تعلیم وتربیت کے لئے کوئی سرکاری ادارہ ہندوستان میں سلاطین اور بادشاہوں کے دور میں کہیں نظر نہیں آتا، جو سڑکیں یا پل انہوں نے بنوائے وہ بھی بنیادی طور پر اپنی فوجی اور مواصلاتی ضروریات کے پیش نظر بنائے۔ سرکاری رسل و رسائل کی سہولتوں کی خاطر۔ مگر خالص عوامی مفاد میں کوئی کام انہوں نے نہیں کیا۔

جس طرح کسی قسم کے شاہانہ وسائل کے نہ ہوتے ہوئے سرسید احمد خان نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسی عظیم الشان یادگار اپنے پیچھے چھوڑی ہے کسی شاہ جہان، کسی اکبر یا کسی اورنگ زیب نے خالص رفاہِ عامہ کے نقطۂ نظر سے اپنی رعیّت کی تعلیم وتربیت اور عوام کی ترقی وخوشحالی اور اُن کی صحت و بہبود کیلئے کوئی ادارہ یا عمارت نہیں بنوائی۔ تاج محل، شاہی قلعہ، شالیمار باغ اور بادشاہی مسجد جیسی مساجد تو انہوں نے خود اپنے آرام وآسائش اور اپنے نام ونمود کیلئے بنوائیں۔ تاریخ کے وسیع تناظر میں سرسید احمد خان کی عظمت کے سامنے وہ سب پست اور ٹھگنے لگتے ہیں۔

بادشاہ کی صورت میں عوام کی نظروں کے سامنے ایک مرکز اور محور ضرور موجود تھا جس کی طرف وہ دیکھتے تھے اور جس کے سبب ہم آہنگی اور یک جہتی کا ایک احساس ان میں جنم لیتا تھا۔ اس ہم آہنگی اور یک جہتی کی بنیاد بادشاہ کی ذات سے ان کی وفاداری کا تصور تھا ان کے پیش نظر اس سے بلند تر اور کوئی نصب العین نہ تھا۔ 1857ء میں جب شخصی حکومت کا آخری نام نہاد نشان بھی نہ رہا تو اجتماعی ہم

آہنگی اور یک جہتی کا جو ایک بے نام سا احساس انہیں حاصل تھا وہ بھی جاتا رہا۔ کوئی ایسا مرکز اور محور نہ رہا۔ جس سے وہ خود کو وابستہ سمجھتے۔ وہ شتر بے مہار کی مانند بے سمت اور بے منزل ہو گئے۔ سلطنت تو ان کے ہاتھوں سے گئی ہی تھی، زندہ رہنے کا حوصلہ بھی جاتا رہا۔ کوئی جہاں، جس جگہ تھا، وہیں بے دست و پا پڑا تھا۔ نہ پیچھے کی سُدھ بُدھ نہ آگے کا ہوش۔ انگریز جو اَب بلا شرکت غیرے ان کے حکمران تھے مسلمانوں کو ختم کرنے پر کمر بستہ نظر آتے تھے۔ 1857ء میں جو خون ریزی ہوئی اور جو انگریز مرد عورتیں اور بچے اس ہنگامے میں مارے گئے اس کی ساری ذمہ داری وہ مسلمانوں پر تھوپ کر انہیں ملیامیٹ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہندو مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ زندگی کے کسی شعبے میں کوئی مسلمان نظر نہ آئے۔ اس وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کی ایک جھلک سر سیّد کے اس خط میں نظر آتی ہے جو انہوں نے لندن سے سیّد مہدی علی خان کو لکھا۔

''بھائی مہدی تم پائونیئر (Pioneer) اخبار الہ آباد کے ایک آرٹیکل کا ترجمہ سنو'' وہ لکھتا ہے کہ '' آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کے خاندان روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ صرف بنگالہ میں، تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں وہ بھی ضعیف ہیں۔ جلد پنشن لے لیں گے اور ان کی جگہ یقیناً کوئی مسلمان نہیں ہونے کا، اور آئندہ بجز چپڑاسی اور دفتری کے کوئی مسلمان کسی معزز عہدہ پر نہیں ہوگا۔ دیکھو، جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا، اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔''[111]

ایک اور خط میں جو کسی عربی مدرسہ کے بارے میں لکھا، کہتے ہیں کہ

''جانِ من! جنابِ من! ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان، ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس، امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس، پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی! کچھ فکر کرو۔ یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس

طرح ہوتی ہے اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آ کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کافر، مردود، گردن مروڑی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا؟''[112]

جو مریض ہمت ہار چکا ہو اور جن امراض نے اسے گھیر رکھا ہو ان کا کوئی علاج بھی نظر نہ آ رہا ہو ایسے مریض کی جان بچانا کسی مسیحا کا ہی کام ہے۔ سرسیّد نے نہ صرف مریض کے لیئے دوائیں تجویز کیں بلکہ اس کے دل میں زندہ رہنے کی اُمنگ بھی پیدا کی۔ اس کے دست و بازو جو بے حس و حرکت ہو چکے تھے ان میں نہ صرف جان ڈالی بلکہ کچھ کر گزرنے کی تڑپ بھی پیدا کی۔ جو دوائیں سرسیّد نے تجویز کیں وہ بنی بنائی کسی میڈیکل سٹور سے دستیاب نہیں تھیں۔ ان کا خمیر بھی انہوں نے خود ہی اٹھایا اور ان ساری دواؤں کو خود ہی تیار کیا۔ پھر ضدی اور بگڑے ہوئے مریض کو وہ دوائیں استعمال کرنے پر آمادہ بھی کیا۔ چالیس سال کی مختصر سی مدت میں سرسیّد نے وہ کام کر دکھایا جو کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ سوچنے اور سمجھنے سے عاری لوگوں کو جن کے سامنے نہ کوئی منزل تھی نہ کوئی راستہ، نہ صرف منزل کا تصور دیا بلکہ اس تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھایا۔ نہ صرف راستہ دکھایا بلکہ انہیں عزمِ سفر بھی دیا اور زادِ سفر بھی عطا کیا پھر انہیں اکٹھا کر کے ایک قافلے کی صورت میں اپنے پیچھے لگایا، نہ صرف ان کی دستگیری کی بلکہ ان کی راہنمائی بھی کی۔ تختِ دہلی کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کے ذہنوں میں سے ایک مرکزی تصور جو گم ہو گیا تھا سرسیّد نے اس خلا کو پُر کیا مسلمانوں کو ایک نصب العین عطا کیا۔ علی گڑھ کو اُن کے لیئے ایک محور اور ایک مرکز کی حیثیت دی۔ جو تخت، بادشاہ نے خالی کیا تھا اس پر قوم کے تصور کو بٹھایا۔ ہندوستانی مسلمان بادشاہ کے اردگرد جمع ہو کر پروانہ وار اس پر نچھاور ہوتے تھے۔ وہ بادشاہ کو اپنی یک جہتی اور باہمی ربط و ضبط کا واحد سبب سمجھتے تھے۔ اس کی جگہ سرسیّد نے قومی عزت و وقار کا چراغ روشن کیا اور اُنہیں اس چراغ کی لو پر پروانہ وار مر مٹنا سکھایا۔ بادشاہ جیسے ایک فانی اور خود پرست وجود کو سرسیّد نے ایک اعلیٰ اور ارفع تصور سے بدل دیا جو بیک وقت مذہبی بھی تھا اور قومی بھی۔ پہلے جو کچھ وہ بادشاہ کے لیئے کرتے تھے، اب قوم کے لیئے کرنے لگے۔ انگریز حکمران ان کے بادشاہ کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ وہ نہ صرف ان کی جان کا دُشمن تھا بلکہ ایمان کا دُشمن بھی تھا۔ ان کے لئے ان کے بادشاہ کا نعم البدل قومی عزت و ناموس اور قومی عظمت کا وہ تصور ہی ہو سکتا تھا جو سرسیّد نے انہیں عطا کیا۔ پہلے وہ بادشاہ کے رُوپ میں اپنی شناخت اور

اپنی عظمت کو جلوہ گر دیکھتے تھے اب علی گڑھ کالج کی بلند و بالا عمارات ان کی عزت اور عظمت کا نشان بن کر اُبھرنے لگیں۔ اس طرح سرسیّد نے مسلمانوں کو قومی خدمت اور قومی ہمدردی کے ایک نئے رشتے میں پرو دیا۔ وہ لوگ جو کسی اجتماعی فائدے کے لیئے دس پیسے دینے کو تیار نہ تھے بلکہ جو کسی قسم کے اجتماعی یا قومی مفاد کے تصور سے ہی نا آشنا تھے انہوں نے سرسیّد کی تحریک پر علی گڑھ کالج کے لیئے لاکھوں روپے کا چندہ دے دیا۔ برِصغیر کی تاریخ میں پہلی دفعہ سرسید نے اپنے منتشر اور بکھرے ہوئے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو ایک نئے قومی احساس کے تحت متحرک کر دیا۔ یہی سرسیّد کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور قوموں کی تاریخ میں کسی بھی حوالے سے کسی لیڈر کا اس سے بڑا کارنامہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

سرسیّد احمد خان کے بے مثال تدبّر، ان کی کمال بالغ نظری اور بے پناہ سیاسی اور سماجی شعور کا اندازہ آپ اس تاریخی حقیقت سے کریں کہ بنارس میں رونما ہونے والے اُردو ہندی جھگڑے کے ایک چھوٹے سے واقعہ سے سرسیّد ہندو مسلم تنازع کے مسئلہ پر 1867ء میں جس نتیجے پر پہنچ گئے تھے، جدید ترین تعلیم اور اعلیٰ ترین انگریزی دانی کے باوجود اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کو اُسی نتیجے پر پہنچنے کیلئے اپنی سیاسی زندگی کے تقریباً پچیس تیس سال لگ گئے۔ سرسید نے 1867ء میں ہی کتنے واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان زندگی کے کسی شعبے میں کبھی متحد نہیں ہو سکیں گے۔ اُن کے درمیان حائل خلیج وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جائے گی۔ جو زندہ رہے گا، وہ دیکھے گا۔

پھر آپ ذرا اس نکتے پر غور کریں کہ سرسید احمد خان آل انڈیا نیشنل کانگرس کے بنتے ہی اُس کے مسلم دُشمن عزائم کو بھانپ گئے تھے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو شروع سے ہی کانگرس سے دُور رہنے کی نصیحت کی، بلکہ اُنہوں نے فرمایا، ''یہ جو الفاظ ہیں نیشنل کانگرس...... ان سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب، مختلف ذاتوں اور برادریوں کے جو لوگ بس رہے ہیں وہ ایک قوم ہیں یا ایک قوم بن سکتے ہیں اور اُن کے مقاصد اور آرزوئیں ایک ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل ناممکن ہے اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگرس قسم کی کسی چیز کا وجود بھی ممکن نہیں۔''

سرسیّد اور اُردو اَدب

شمس العلماء شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ سرسید کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اُردو لٹریچر بھی ہے۔[113] سرسیّد کے اُردو ادب پر جو احسانات ہیں ان کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی کے اس فصیح و بلیغ جملے کے بعد مزید کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ بہر حال اس اَمر کا جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جن سے سرسیّد کے ہاتھوں اُردو ادب پر انقلاب آفریں اور دُور رس اثرات مرتب ہوئے۔

سرسیّد سے پہلے 1802ء میں میر امن دہلوی کی باغ و بہار زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی تھی۔ جس سادگی اور صفائی سے روز مرہ اور محاورے کی چاشنی دے کر میر امن دہلوی نے اس کتاب میں قصۂ چہار درویش بیان کیا ہے اور اس میں جو لطفِ بیان پیدا کیا ہے اس کی مثال اس سے پہلے اُردو ادب میں کہیں نہیں ملتی۔ عبارت کی روانی اور شیریں بیانی میں میر امن دہلوی کا جواب نہیں۔ مگر یہ محض محاورے کا چٹخارہ اور زبان کی لذّت ہے اس سے قاری کی جمالیاتی حس تو حظ اُٹھاتی ہے مگر اس کے دل پر کوئی گہرا یا دیر پا اثر مرتب نہیں ہوتا۔ ویسے بھی باغ و بہار قصہ کہانی ہے خوش وقتی کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنف کے پیشِ نظر اس کے علاوہ اور کوئی مقصد یا نصب العین نہیں ہے۔ سرسیّد کا مقصد قاری کو لطفِ بیان اور اظہار کی لذّت مہیا کرنا نہیں بلکہ اس کی قلب ماہیت کرنا ہے۔ بڑے ادب پارے کی ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آپ کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد آپ وہ نہیں ہوتے جو اس کے مطالعے سے پہلے ہوتے ہیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ سرسیّد کی تحریریں بڑا ادب پارہ ہیں یا نہیں مگر یہ خصوصیت ان میں بہر حال موجود ہے۔ وہ آپ کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ آپ کے فکر و عمل میں انقلاب برپا کر دیتی ہیں۔ آپ اصلاحِ احوال کے رستے پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ سرسیّد کی تصنیف و تالیف کا یہی مقصد تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو سرسیّد اُردو ادب میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے شعوری کوشش

سے مقصدی ادب تخلیق کیا۔ سرسیّد کے تخلیق کردہ مقصدی ادب کا اسلوب وعظ ونصیحت کا نہیں بلکہ اپنے مزاج کے لحاظ سے خالص علمی وادبی ہے۔ ان تحریروں میں بے تکلف اور سیدھے سادے انداز میں دلیلوں اور منطق سے کام لیکر قاری کے دل ودماغ کو قائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سرسیّد چونکہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچنا چاہتے تھے اس لیے ادائے مطلب کے لیئے انہوں نے ایسا اسلوبِ بیان اختیار کیا جس کا فوری اثر پڑھنے والوں پر ہو۔ وہ محض واہ واہ کرنے کو ہی حاصل مطالعہ نہ سمجھیں بلکہ گہرا اور دیرپا اثر قبول کریں۔ جو کچھ پڑھیں اس پر سوچنے اور غوروفکر کرنے لگ جائیں۔ اس اسلوب میں کسی قسم کی لفظی بازی گری کی گنجائش نہ تھی۔ چونکہ سرسیّد کا ہر بیان سچائی اور خلوصِ نیت پر مبنی تھا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اپنے دل کی گہرائیوں سے کہتے تھے اس لیے ان کے اسلوب میں کسی قسم کی کوئی بناوٹ یا سجاوٹ نہ تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا قاری حسنِ بیان کی لذتوں میں گم ہوکر رہ جائے۔ ان کا منشاء یہ تھا کہ وہ جو کچھ پڑھے اس پر غور کرنے لگ جائے۔ سرسیّد نے شعوری طور پر ایسے اسلوب کو اپنایا۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''جہاں تک ہم سے ہو سکا، ہم نے اُردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دِل میں ہو وہی دوسرے کے دِل میں پڑے تاکہ دِل سے نکلے اور دِل میں بیٹھے۔''[114]

ادیب اور شاعر صرف قصے کہانیاں یا عشق وعاشقی کی داستانیں لکھا کرتے تھے۔ سرسیّد ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اُردو زبان کو ہر طرح کے علمی سائنسی، تحقیقی، مذہبی، اخلاقی، سماجی، ثقافتی، تاریخی، صحافتی اور سیاسی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور ان موضوعات پر جن پر پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا ایسے دلنشین اور موثر انداز میں لکھا کہ پڑھنے والوں نے اسے قصے کہانیوں سے زیادہ دلچسپ پایا۔ قارئین اس غیر محسوس طور پر سرسیّد کے نقطۂ نظر کے قائل ہو جاتے تھے کہ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا تھا ان کے خیالات ونظریات میں تبدیلی کیونکر آ گئی۔ سرسیّد کے مخالفین کہا کرتے تھے کہ سرسیّد کے مضامین مت پڑھو۔ ان کے پڑھنے سے آدمی اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہتا۔

سرسیّد احمد خان کے مزاج اور طبیعت میں جو زندہ دلی شگفتگی شوخی اور ظرافت تھی اس نے ان کی تحریروں کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔ ہنسی مذاق میں جو بات وہ ذہن میں ڈال دیتے ہیں پھر نکالے نہیں

نکلتی۔ اس کتاب میں سرسید کی مختلف تحریروں سے کئی اقتباسات دیئے گئے ہیں جن سے ان کے اسلوب تحریر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک دو اقتباسات مزید نقل کئے جاتے ہیں۔

تہذیب الاخلاق میں ایک مضمون طریقۂ زندگی کے عنوان سے لکھا۔ رقم طراز ہیں۔ ''یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہاتھ سے کھانا مسنون ہے (یعنی آنحضور اور صحابۂ کرام کا طریقہ ہے) اور اس کو حقیر سمجھنا کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ ہم اس رائے کی صحت وسقم کی بحث سے قطع نظر یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کی آدھی پیروی کرنا باعثِ ذلت ہے اگر مسلمان یہ بھی گوارہ کریں کہ مرغن کھانے جن سے ہاتھ اور منہ بھر جاتا ہے اور یہی امر باعث نفرت اور گھن آنے کا ہوتا ہے، چھوڑ دیں اور جو کے بن چھنے آٹے کی سوکھی روٹی ککڑی یا کھجور سے کھا لیا کریں تو ان بزرگوں کی پوری پوری پیروی ہوگی، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ کھانے تو ہوویں فرعونی اور طریق کھانے کا ہو مسنونی۔''[115]

تہذیب الاخلاق جب بند ہوا تو سرسید نے اس کے آخری پرچے میں لکھا۔

''سورتوں کو جھنجوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہوگیا اور نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے، ادھر ہاتھ جھٹک دیا اُدھر پیر جھٹک دیا اور اینڈے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیئے۔ بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے۔ تم ٹھہر جاؤ۔ ہم آپ ہی کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت منہ بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا! پی لے، پی لے۔ تم چپ رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔ لو، بھائیو اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو پی لو پی لو۔''[116]

سائنٹیفک سوسائٹی انسٹی ٹیوٹ گزٹ جسے اردو میں علی گڑھ اخبار کہا جاتا تھا اور تہذیب الاخلاق جسے انگریزی میں سوشل ریفارمر کا نام دیا گیا دو ایسے پرچے تھے جنہوں نے ملک کے طول و عرض میں پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنی جمود اور زنگ پر بڑی کاری ضرب لگائی۔ ایسے موضوعات پر مضامین شائع کئے جن میں معاشرے کے ہر فرد کی دلچسپی تھی۔ یہ موضوعات روزمرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرتے تھے۔ ان پرچوں سے لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا عام شعور اور شوق پیدا ہوا۔ اس سے اردو زبان وادب کی

اشاعت ہوئی۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کے ساتھ ہی سرسید کے ایما پر اور اُن کی کوششوں سے شمال مغربی صوبہ جات کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور نے اپنی طرف سے ایک انعامی اشتہار شائع کیا کہ جو شخص انسٹیٹیوٹ کے لیے کوئی کتاب یا علی گڑھ اخبار کے لیے کسی علمی یا سائنسی موضوع پر کوئی مضمون اُردو میں لکھے گا اُسے انعام دیا جائے گا۔ اس اشتہار کے شائع ہونے پر بہت سے لوگ جن میں لکھنے کا ملکہ تھا اور وہ اسے کام میں نہیں لاتے تھے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ سماجی مذہبی اخلاقی اور تعلیمی موضوعات پر تہذیب الاخلاق میں سرسیّد نے اور ان کی تحریک پر نواب محسن الملک سید مہدی علی خان اور ان کے دوسرے کئی ساتھیوں نے ایسے چبھتے ہوئے مضامین لکھے کہ موافق اور مخالف دونوں طرح کے لوگوں میں ان کی بڑی اشاعت ہوئی یہ مضامین بڑی توجہ سے پڑھے گئے۔ مخالفین نے ان کا جواب اسی اسلوب اور انداز میں لکھنے کی کوشش کی جو اسلوب اور انداز ان مضامین کا تھا۔ اس طرح اُردو مضمون نویسی کی صنف خوب پھلی پھولی۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے انگریزی کے مشہور مضمون نگاروں ایڈی سن اور اسٹیل کے کئی مضامین کا ترجمہ اُردو میں کیا جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے ان تراجم نے اُردو نثری اَدب کے لیے گویا ہوا کے تازہ جھونکے کا کام کیا۔ اس سے نثر نگاری کے نئے رجحان کے پھیلنے میں بہت مدد ملی۔

سرسیّد احمد خان کی طرز تحریر اور ان کے اسلوب نگارش کے بارے میں نقادانِ ادب نے یہ کہا ہے کہ اس پر میرزا غالبؔ کے خطوط کا بہت اثر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسیّد کی نثر کا بے تکلف سیدھا سادا اور گفتگو کا انداز جس میں شوخی اور ظرافت ہے غالبؔ کے خطوط کی یاد دلاتا ہے۔ غالبؔ نے جس انداز میں مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا اور اپنی شوخی اور تخلیقی اپج سے اُردو نثر میں جو شگفتگی پیدا کر دی اس کا اثر یقیناً سرسیّد نے قبول کیا ہوگا، مگر انہوں نے غالبؔ کی تقلید ہرگز نہیں کی۔ سرسیّد کا اسلوب اپنا ہے سرسیّد قواعدِ زبان روزمرہ اور محاورے کا کوئی خاص لحاظ اپنی تحریروں میں نہیں رکھتے۔ ان کا مقصد ادائے مطلب سے ہے۔ الفاظ کی نشست اور بندش پر وہ کوئی توجہ نہیں دیتے۔ دراصل وہ اپنی طرف سے شعوری طور پر ادب کی تخلیق میں مصروف ہی نہ تھے وہ تو کسی نہ کسی طرح اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ان کی مثال تو ایک ایسے شخص کی تھی جس کے مکان میں آگ لگی ہو اور وہ لوگوں کو بے اختیار پکار رہا ہو کہ لوگو! بھاگو جلدی پہنچو، آگ بجھاؤ۔ ایسے میں ان کا دھیان الفاظ کی

نشست اور جملوں کی بندش کی طرف کیا جاتا۔ وہ تو اضطرار و اضطراب کی کیفیت میں اپنے قلم کو سرپٹ دوڑا رہے تھے۔ ان کی تحریروں کا جو اسلوب اور اسٹائل بنتا ہے وہ بے ساختہ فطری طور پر ان کی شخصیت کا سٹائل ہے۔ وہ جو انگریزی میں کہا گیا ہے کہ Style is the man تو یہ کہاوت سرسیّد احمد خان پر سوفی صد صادق آتی ہے۔ ان کی تحریروں میں جو زور ہے جو اثر انگیزی ہے جو سادگی اور بے ساختگی ہے وہ ان کی اپنی غیر معمولی شخصیت کی ہے۔ اسی سے اُردو ادب میں دوسروں کے اسلوب کی تقلید کرنے کا رجحان کمزور پڑا اور ایسی رو چل نکلی جس میں ہر لکھنے والے نے اپنی منفرد شخصیت کا اظہار اپنے اسلوب میں کیا۔ سرسیّد کی یہ عطا کیا کم ہے کہ ان کی وجہ سے اُردو لکھنے اور پڑھنے والوں کو اُردو زبان کی تنگیٔ داماں کا گلہ جاتا رہا ہے۔ سرسیّد نے ثابت کر دیا کہ اُردو زبان ہر طرح کے مطالب اور ہر طرح کے علمی مضامین بیان کرنے کی وافر صلاحیت رکھتی ہے۔

کتابیات اور حوالہ جات

نمبر شمار	نام کتاب	صفحہ نمبر
1-	لائل محمڈنز آف انڈیا جلد اوّل	11
2-	مکتوبات سرسید	87
3-	حیات جاوید	5
4-	سفرنامہ پنجاب	198
5-	ایضاً	17
6-	حیات جاوید	22
7-	سیرت فریدیہ	31
8-	حیات جاوید	29
9-	سیرت فریدیہ	28,21
10-	حیات جاوید	35
11-	ایضاً	31
12-	سیرت فریدیہ	36
13-	ایضاً	36
14-	حیات جاوید	45
15-	ایضاً	46
16-	ایضاً	55
17-	غالب اور سرسید راوی لاہور جنوری 98	36
18-	ایضاً	36
19-	حیات جاوید	61
20-	ایضاً	67
21-	غالب اور سرسید راوی جنوری 98	36
22-	ایضاً	41
23-	سید کا سناریو۔ ادبیات اسلام آباد 794	98

24- حیاتِ جاوید 69
25- ایضاً 70
26- سفرنامہ پنجاب 261
27- حیاتِ جاوید 76
28- ایضاً 79
29- ایضاً 80
30- ایضاً 89
31- حیاتِ جاوید 100
32- مطالعۂ سرسید، مرتبہ مولوی عبدالحق 222
33- حیاتِ جاوید 115,114
34- ایضاً 119
35- ایضاً 124
36- ایضاً 120
37- ایضاً 140
38- ایضاً 144
39- مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید 401
40- سفرنامہ پنجاب 176
41- مسافرانِ لندن 38
42- ایضاً 42
43- ایضاً 156
44- ایضاً 268
45- خطوطِ سرسید 35
46- حیاتِ جاوید 164
47- علی گڑھ گزٹ مورخہ 11 نومبر 1870
48- حیاتِ جاوید حصہ دوم 127
49- خطباتِ احمدیہ 304
50- ایضاً 207
51- ایضاً 224
52- حیاتِ جاوید حصہ دوم 164
53- ایضاً 188
54- ایضاً 141
55- ایضاً 141

56- ایضاً 148

57- ایضاً 142

58- حیاتِ جاوید حصہ اوّل 174

59- ایضاً 179

59-ب روزنامہ جنگ 24 مارچ 2002 (جو بیچتے تھے دوائے دل۔ تحریر۔ جیون خان)

60- سفر نامہ پنجاب 255

61- حیاتِ جاوید 180

62- مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید 508

63- حیاتِ جاوید 212

64- ایضاً 216

65- ایضاً 199

66- مقالاتِ سرسید حصہ دوم 228

67- حیاتِ جاوید 292

68- مجموعہ لیکچرز محسن الملک 323

69- حیاتِ جاوید 185

70- ایضاً 184

71- ایضاً 225

72- ایضاً 230

73- ایضاً 232

74- ایضاً 142

75- پاکستان ان دی میکنگ مرتبہ لطیف احمد شیروانی

76- حیاتِ جاوید 248

77- ایضاً 262

78- ایضاً 272

79- ایضاً 274

80- مکتوباتِ سرسید 364,629

81- حیاتِ جاوید 281

82- مکتوباتِ سرسید

83- رائیٹنگز اینڈ اسپیچز آف سرسید احمد خان 245

84- مکتوباتِ سرسید 328

85- دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خان 273

86- مکمل مجموعہ لیکچرز آف سرسید احمد خان 429

-87	ایضاً	422
-88	ایضاً	417
-89	حیات جاوید	303
-90	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسیّد	129
-91	مکتوبات سرسیّد	376
-92	حیات جاوید	305
-93	ایضاً	310
-94	ایضاً	314
-95	ایضاً	445
-96	ایضاً	445
-97	ایضاً	493
-98	دی لائف اینڈ ورکس آف سر سید احمد خان	265
-99	حیات جاوید	475
-100	ایضاً	474
-101	ایضاً	477
-102	مکتوبات سرسیّد	38
-103	علی گڑھ اخبار یکم ستمبر 1876	
-104	تہذیب الاخلاق جلد دوم	573
-105	حیات جاوید	496
-106	ایضاً	496
-107	ایضاً	465
-108	مکتوبات سرسید	699
-109	حیات جاوید	486
-110	مطالعہ سرسید مولوی عبدالحق	76
-111	حیات جاوید جلد دوم	90
-112	ایضاً	57
-113	مطالعہ سرسیّد احمد خان مرتبہ مولوی عبدالحق	9
-114	ایضاً	114
-115	مقالات سرسیّد جلد پنجم	39
-116	مطالعہ سرسیّد احمد خان	17